ماہتاک کوئٹہ

سنگت

JUNE 2024

سڑدارناوتاخ

نذیری

سڑدارے وتاخ اے باخواے
ہنوا ے ہشار آ خاخو اِے
نئے چدنا غم
نئے زِندنا غم
نئے خاک اَتو مہرے، ڈیہہ نا غم
نئے شام نا غم، نئے دے نا غم
نئے زِند نا چس اے اَنگے
نئے آب نا مرک ئٹ خاچگے

ہتو اِے کنا مُلا، ماشر
فنکار کنا شاعر نوکر
سڑدارا ے فرشتہ لِکھنگو
سڑدار نا عقل آ ہلنگو
سڑدار نا زندے اِلنگو
سڑدار اَتو بُجھی چِلنگو

سڑدارے وتاخ اے باخواے

سڑدار نا مونا اَتو اے
چوکاٹ آلغو اے بڑواے
کفوا ے چوٹ آتے مُرا آ
غصہ اے ڈلوا ے کیدواے
نئے مرّ و گر نئے گمرائی
نئے اوڑے کروا ے وڈائی
اَرفوے چلچین کس بھلو
سڑدار نا ڈوتے سِلّواے
ہتو اے کنا چیمن ریشی
سائیں کہ کروا ے لڑزواے
ورنا اے مدان آ جلّو اے
سڑدارے خنو ٹولو اے
تپوا ے ڈغارے کوندواے
تینا کہ اراتی پُچرینگا
سڑدار ناوڑتان گنڈو اے
پڈام اے عقل تہ تخواے
کف کیک چڑہ بس جرڈواے

کوڈک اے ہراغان کفواے
ایڑو اے وڑکو اتو اے
ہائی کہ اَسّل پرواف تہ
غورانٹ خلوا ے ترخواے
گواپ آتے اَرائی نا تینا
چلّو ے الوا ے کشکواے
ہتوا ے کنا چیمن ریشی
سڑدار نا مارے جی جی کے
داراج نذیری بے بجت آ
زیدادے غلامی نا ہڑدے
بے عقل آبج اے اتواے
سڑدار نا ظلم اے سگھواے
غل کس امالپ اتنے تینا
زیزاد نا بے خواہندی

Reg No. DCS-6 مسلسل ماہانہ اشاعت کا 27 واں سال

ماہتاک کوئٹہ

سنگت

Vol.27
JUNE 2024
NO.07

ایڈیٹر

شاہ محمد مری

پرنٹر

صادق پرنٹنگ پریس کوئٹہ

ایڈیٹوریل بورڈ

جاوید اختر، جمیل بزدار، عابدہ رحمٰن، جہاں دوست، شاہ ملوک

قیمت 200 روپے | ششماہی 1200 روپے | سالانہ 2400 روپے

ISSN-2520-4070

ملتان : رانا شہباز 03009632552 ،اور نواز پاندا 03008634392

کراچی : عیسیٰ بلوچ 03222609415 ،اور شاہ زمان 03002103503

ساہیوال : زکریا خان 03006931011

0812827968 , 03003829300 editor@sangatacademy.net

MARRI LAB DR SHER MUHAMMAD ROAD QUETTA www.sangatacademy.net

SHONGAAL

3	دڑد ژہ بےدڑداں دلیخی آں

KISSA

منگل پانڈے	آغا گل	36
امرود کی مہک	ارشد رضوی	39
کپاس کا تاجر اور بڑھیا	صدرالدین عینی/شاہ محمد	41
ریمائنڈر	حسن مسعود	44
عبداللہ مراثی	مصباح نوید	45

POHOZAANT

ریاست اوانقلاب	لینن/شاہ محمد مری	6
ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ	ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن بلوچ	10
استاد امام الدین صلاحی بلوچ	میر بلوچ خان	12
کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر	شاہ محمد مری	15
ایک اداریہ	شاہ محمد مری	19
لیبر ڈے	سعدیہ شکیل	22
رسول بخش پلیجو	شاہ محمد مری	24
لونہڑانی موسم ءَ۔۔۔۔	مہتاب جکھرانی	29

SHERAANI RALI

احمد ندیم قاسمی، نذیری	--
آمنہ آبڑو	9
اعجاز احمد بلوچ، دانیال طریر	14
کاوش عباسی	20
شاہ زمان بھنگر، سلیم شہزاد، میر ساگر	23
عابد رضا	29
والادی میر مایا کوفسکی/شاہ محمد مری	30
نسیم سید	32
نصیر احمد ناصر	33
جی آر شاری	35
فاطمہ حسن	38
توقیر چغتائی	40
صادق مری، جاوید صبا	48

HAAL HAWAAL

عوامی ادبی سنگت کراچی	انجیلا ہمیش	32
سنگت ادبی دیوان لیاری	رمضان بلوچ	33

KITAB PACHAAR

موت کے بعد کا بدلا ہوا آدمی	شاہ محمد مری	34

دڑد ژہ بے دڑداں دیلنجی آں

سود در سود کی طرح فلسطین کی بربادی بھی بربادی در بربادی ہے۔ یہ ہلکا نہیں قولنجی درد ہے۔ یہ درد یک مشت نہیں پیہم ہے۔ جس کا اگلا دورہ پچھلے دورے کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کرتا۔ درد کا دَرَپ (حملہ آوری) ایک آدھ دن ماہ یا سال کا نہیں ہے، یہ تو پون صدی پرانا پھیروں والا دَرَپ ہے۔ اس کی جڑیں بیسویں صدی کے اوائل تک جاتی ہیں۔ اس کے باشندوں نے نقل مکانی، تشدد اور قتلِ عام کے ہزاروں پھیرے لیے، خوف نقصان اور ناانصافی کے کئی راؤنڈ بھگتے۔

فلسطین پہ عذاب دراصل برطانوی و امریکی سامراج کا پیدا کردہ ہے۔ انہی دو قوتوں نے 1940 کی دھائی میں اقوام متحدہ سے اس علاقہ میں دنیا بھر کے یہودیوں کے اُمڈ آنے کی اجازت کا ووٹ منظور کرایا تھا۔ 1948 میں اسرائیل کی ریاست قائم کروادی گئی جس سے ہزاروں فلسطینیوں کو نقل مکاں ہونا پڑا۔ اسے وہ ''نکبہ'' کہتے ہیں یعنی آفت نسلی صفائی (نسل کشی)۔ نکبہ میں ساڑھے سات لاکھ فلسطینیوں کو تشدد کے ذریعے اپنے گھروں سے بے گھر کر دیا گیا تھا۔ اس اندوہ کی یاد وہ اب بھی دنیا بھر میں مناتے ہیں۔ اسرائیل کا قیام اور فلسطین کے ساتھ اس کی مدبھیڑ ایک سیاسی، علاقائی اور انسانی المیہ تھا۔

نکبہ ایک ختم نہ ہونے والی آفت ہے۔ تاریخ کو یاد ہے کہ بعد میں اسرائیل نے 1967 میں ویسٹ بنک اور غزہ پٹی پر قبضہ کر لیا اور تشدد و تشنج کے ابدی بیج بو دیے۔ فلسطینی نہ آزادانہ حرکت کر سکتے ہیں، نہ اپنے گھروں کو اسرائیلیوں کی طرف سے گرا دینے سے بچا سکتے ہیں۔ اور نہ خود کو نقل مکانی سے روک سکتے ہیں۔

نکبہ ایک ختم نہ ہونے والی بربادی ہے۔ 1982 میں بھی سات ہزار فلسطینی قتل کر دیے گئے تھے۔ اسرائیلی قابضین، ہیلی کاپڑ گن شپ کی حفاظت میں فلسطینی عبادتگاہوں میں گھس گئے اور قتل و غارت شروع کر دی۔ تب انتفادہ شروع ہوا تھا۔

برطانیہ اور امریکہ نے ہی اسرائیل کو اس پورے علاقے پر قبضہ کرنے کی اجازت کی آنکھ ماری تھی۔ اسی امریکہ نے سارے پون صدی طویل عرصے میں اسرائیل کو پالا، پوسا اور طاقت ور بنا دیا۔ اسی امریکہ نے اقوام متحدہ میں اسرائیل کی توسیع کی حرکتوں کے خلاف پیش کردہ ہر قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ یہی امریکہ دوسرے ممالک سے اسرائیل کے لیے رعایت در رعایت لیتا رہا ہے۔ مصر کو کیمپ ڈیوڈ مذاکرات کو اسرائیل کے حق میں لوٹا گیا تھا۔ پھر وہی بات فلسطینیوں پر اوسلو میں مسلط کی گئی۔ امریکہ فلسطین کی آزاد مملکت کے مطالبے سے بھی فلسطینیوں کو دستبردار کرنے کی کوششیں کرتا رہا۔ امریکہ فلسطین کی تحریک آزادی میں خوب دراڑیں ڈالنے، اور فلسطینی اتھارٹی کو مکمل طور پر کرپٹ بنانے کا ہول ٹائمر بنا ہوا ہے۔

اور پھر 2024 میں حماس کی جانب سے اسرائیل پہ اچانک حملے نے فلسطینیوں پہ طویل دورانیے کی دوزخی حدت برسانے کا بہانہ فراہم کیا۔ حماس اور اسرائیل دونوں رائٹسٹ قوتیں ہیں۔ کچھ پتہ نہیں کہ یہ دونوں رائٹسٹ قوتیں کب ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں اور کب باہم لڑتی ہیں۔ لڑتی ہیں بھی کہ نہیں؟

امریکہ دنیا بھر میں، ٹیررازم، فنڈامنٹلزم اور رجعت کا کور کمانڈر رہے۔ بین الاقوامی کیپٹلسٹ امریکہ، فاشزم کا مالک ہے۔ کیا خبر وہ کب اپنے کس پیادہ کو بلا کر اس سے اپنے گرینڈ منصوبے کی ابتدا کراتا ہے۔ کوئی کیا جانے، مصر، عراق، شام کو تو کھنڈر بنا دیا اُس نے، اب فلسطین کو اس طرح کھدیڑ

کر رکھ دینا کہیں اسی پالیسی کا تسلسل تو نہیں؟۔

امریکہ تیل سے مالا مال مشرق وسطی اور اس کے آس پاس کے ہمارے سارے خطے کو اپنی چنگلوں میں رکھنا چاہتا ہے۔ دنیا میں اسے بادشاہت قبول ہو یا نہیں مگر مشرق وسطی میں سعودی، اردن یو اے ای، وغیرہ وغیرہ میں درجنوں بادشاہ عمامے لہراتے ہوئے متمکن ہیں۔ حرام ہے کہ وہاں امریکہ کے پیٹ میں جمہوریت کا درد اٹھے۔ عرب بادشاہتیں امریکہ کے لیے پٹرول کے اتنے ہی وفادار محافظ ہیں جتنا کہ صیہونی اسرائیل۔ امریکہ ان دونوں کو کبھی بھی تکلیف میں دیکھ نہیں سکتا۔ عرب بادشاہ اور اسرائیلی اس کی آنکھیں ہیں۔

فلسطینی نکبہ ایک جاری پراسیس ہے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ فلسطین کی قومی اور پروگریسو تحریک کو امریکا اور اسرائیل کے ساتھ مل کر عربی بادشاہوں نے مذہبی انتشاری تحریک میں بدل دیا تھا۔

نکبہ ایک جاری پراسیس ہے۔ 1947 میں جو فلسطین تھا، آج اس کا محض 23 فیصد رہ گیا ہے اور وہ 23 فیصد بھی مکمل طور پر اسرائیل کے کنٹرول میں ہے۔ اس نے وہاں چھ لاکھ غیر قانونی سیٹلرز آباد کر رکھے ہیں۔ جگہ جگہ اسرائیلی چیک پوسٹیں ہیں۔

اسرائیل کی ہٹ دھرمی، خونریزی، فلسطین پہ ناجائز تسلط اور امریکہ کی اسرائیل کے شانے پہ ''بلینک چیک'' کی تھپکی۔۔۔ یہ ہے معاملے کی جڑ۔ وہ چاہے ڈیموکریٹ ہو یا ری پبلیکن، بائیڈن سے لے کے، ٹرمپ، اوباما اور دوسرے حکمران، سب ہی نے امریکی مفادات اور قدروں کو اسرائیل کے مماثل قرار دیا۔ امریکہ نے ہمیشہ اسرائیل کو اپنے پارٹنر اور اس کی قدروں کو اپنی قدروں سے قریب جانا اور ہر موقع پہ اپنے مفت اور غیر مشروط تعاون نچھاور کر دیا۔

اس (تا حال جاری) جنگ کا نتیجہ اب تک بڑے پیمانے کی فلسطینی ہلاکت کی صورت میں نکلا۔ عورتوں بچوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ شہری انفراسٹرکچر تباہ کر دیا۔ اسرائیل کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ پوری دنیا میں بدنام اور رسوا ہوا ہے۔ اس کی بربریت عروج پر ہے۔

اسرائیل کے ہاتھوں فلسطین میں حالیہ آٹھ ماہ سے جاری جنگ کی تباہ کاریوں کے واقعات اور اعداد و شمار دنیا سے ڈھکے چھپے نہیں۔ یہ تازہ نکبہ تو تذلیل میں بھی سب سے بڑھ کر ہے۔ اسرائیل یہاں حملہ کرتا ہے تو نہتے فلسطینی شہری بھاگ کر دوسری طرف جاتے ہیں۔ تب اسرائیل وہاں حملہ کرتا ہے اور فلسطینی پھر اِس طرف آتے ہیں۔ روزانہ کی بنیاد پر شکاری کتے فلسطینی آبادیوں کے پیچھے پڑتے ہیں۔ اور انہیں ہزاروں کی تعداد میں جان بچانے کے لیے آگے پیچھے دوڑاتے رہتے ہیں۔

اس بار اسرائیل اس قدر وحشی اور سفاک بن گیا، اُس کے مظالم اتنے دلخراش ہو گئے، اور فلسطینیوں کی یہ نسل کشی اور جینوسائڈ اتنی طویل اور شدید ہو گئی کہ انسانیت کانپ اٹھی۔ ریاستوں اور اُن پہ براجمان حکومتیں تو حسبِ معمول سفاک اور خودغرض رہیں۔ مگر عام انسان اس بڑے جھٹکے اور صدمے سے ہر طرح کی رو رعایت اور اگر مگر سے آزاد ہوا۔ انسان، سراسر انسان بنا، مکمل اشرف المخلوقات بنا۔ ہر جگہ کے عوام اپنی اپنی حکومتوں کی پالیسیوں سے اختلاف کرنے لگے۔ اور اسرائیل کی لگڑ بھگڑی کا سامنا کرنے کے لیے فلسطین کے شانہ بشانہ ہو لیے۔ ہر ملک کا دارالحکومت اور شہری مراکز فلسطین کے پرچموں کے حیران کر دینے والے پُرہجوم اور لمبے لمبے جلوسوں والے شہروں میں بدل گئے۔ پاک انسان، پاک نعرے اور مطالبے لیے اپنے اپنے انداز میں ظالم کا ہاتھ روکنے امڈ آئے۔ اس عوامی پاپولر ردعمل کا اصل علاقہ تو صنعتی مغربی دنیا تھی۔ کیا مرد کیا عورت، بچہ، بوڑھا، معذور، پہلوان، زبان، رنگ، نسل سب کچھ کی تفریق بھاڑ میں ڈالے گلی میں سینہ سپر ہو گیا۔

اور لیڈ کون کر رہا ہے؟۔ یونیورسٹی سٹوڈنٹ لیڈ کر رہا ہے۔ احتجاجی تحریک وہاں کی یونیورسٹیوں نے شروع کر دی۔ وہ دو باتوں کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کی طرف سے فلسطینیوں کی نسل کشی کے خلاف، اور اپنی اپنی حکومتوں کی طرف سے اسرائیل کی مدد کرنے کے خلاف۔ ہم نے ٹی وی چینلوں پر دیکھا کہ کس طرح نام نہاد جمہوری ممالک اِن جلوسوں جلسوں اور دھرنوں پر تشدد کر رہے ہیں۔ ایسی مار پیٹ تو ہمارے جیسے ملکوں کی وحوش

پولیس بھی نہیں کرتی۔

بنی نوعِ انسان کے اِس ردعمل سے بیسیوں برس کی ساری بے روح مایوسیاں چھٹ گئیں۔ایک بار پھر یقین ہوا کہ انسان زندہ ہے، کہ انسانیت زندہ ہے۔اشراف المخلوقاتیت زندہ ہے۔پھر یقین ہوچلا کہ جب بھی ناروائی درندگی کی سرحدوں میں داخل ہوئی، بشر بشر دوستی کا پرچم اٹھا کر مزاحمت میں نکل پڑا۔دیکھتے دیکھتے پوری نوعِ انسانی رنگ، نسل، جنس اور مذہب کی تفریق کو گھر میں چھوڑ کر میدان عملِ میں نکل آیا۔مقبول مطالبہ ہے کہ یونیورسٹیز اپنے سرمائے سے براہ راست یا بلا واسطہ ان کمپنیوں میں سرمایہ کاری بالکل ختم کر دیں کہ جس سے اسرائیل کو فوجی ایکشن میں مدد مل رہی ہے۔اس معاشی منافع کو اسرائیل، جنگ کے لیے ہتھیاروں کی خرید، ملٹری ٹیکنالوجی کی سروسز، یہودی آبادکاری اور فلسطین نسل کشی میں بے دریغ خرچ کر رہا ہے۔

اب تک پچاس ہزار اموات ہو چکی ہیں۔جن میں سے ستر فی صد بچے اور عورتیں ہیں، تین چوتھائی آبادی بے گھر ہو چکی ہے۔ہسپتال اور یونیورسٹیاں تباہ ہو چکی ہیں۔قحط، بھوک اور بیماریاں ہیں۔

دنیا کے عوام امریکہ سے فوری طور پہ جنگ بندی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔انہیں خونخوار اسرائیل کے ساتھ اقتصادی، تجارتی اور فوجی معاہدے اب اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔اقوامِ عالم اسرائیل، امریکہ اور برطانیہ کو جنگی مجرم قرار دینے کے حق میں ہیں۔

آج انسان کی واضح اکثریت خود کو دردمندوں میں شمار کرنا چاہتی ہے۔بالخصوص صنعتی دنیا کا یونیورسٹی سٹوڈنٹ اُن ''بے دردوں'' میں سے نہیں ہونا چاہتا جن سے ''درد'' بے زار ہے۔

جون

*	7 جون	یومِ وفات رسول بخش پلیجو
*	8 جون	یومِ وفات سٹیزن ٹام پین
*	11 جون	یومِ پیدائش ڈاکٹر انوار احمد
*	14 جون	یومِ پیدائش سرور آغا
*	14 جون	یومِ پیدائش چے گویرا
*	18 جون	یومِ وفات وِلما ایسپن
*	19 جون	یومِ وفات جوزی مارٹی

ریاست او انقلاب

شاہ محمد مری

4۔ریاست ءِ ’’رفتہ رفتہ گار بیغ‘‘
او
تشدد والائیں انقلاب

ریاست ءِ ’’رفتہ رفتہ ای گار بیغ‘‘ ءَ بارہ ءَ اینگلز ءِ ٹوک اکھر مشھورنت، اشانی اکھر زیات حوالہ دیغہ بی ،او آں اکھر اوشیشی ءَ گوں مارکسزم ءَ را اپر چونزم ءَ اندر ءَ بدل کنغ ءِ خلاصہ ءَ ڈس انت کہ ما بایدیں ھیڑتی ءَ اشانی پیرا ءَ دَوں۔ ما ھواں سجہ ایں بحث ءَ ھموذ ءَ ژہ کاروں شموذاں کہ ھے زیرے جیثغنت :

’’پرولتاریہ سری سری میز آف پروڈکشن ءَ ریاستی اقتدار ءَ ژہ قبضہ ءَ کنت او آنھاں ریاستی ملکیت ٹاہینی ۔ پر اے ڈول ءَ آں پرولتاریہ ءِ حیثیت ءَ وتی جند ءَ منسوخ کنت ، سجہ ایں طبقاتی فرق و طبقاتی تضاداں منسوخ کنت ، او ریاست ءَ دِہ ریاست ءَ حیثیت ءَ منسوخ کنت ۔ سماج ءَ کہ طبقاتی تضادانی نیاما کار ءَ کنغا یث ، ریاست ءِ ضرورت اث ۔ بزاں استحصال کنوخیں طبقہ ءِ یک تنظیمے ءِ، تا کہ آں پیداوار ءِ وتی خارجی شرطاں برجاہ داشتہ بہ کنت ، او ھے سببا خاص کس استحصال بیوخیں طبقہ ءَ موجودیں موڈ آف پروڈکشن (غلامی ، سرف ڈم یا جبریہ بندش ، اجرتی پورہات) ءِ مقرار کنغیں ظلم و جبر ءِ حالتانی اندرا پہ زور داشتہ بہ کنت ۔ ریاست سجہ ایں سماج ءِ آفیشل نمائندغ اث ، سَہرائیں کارپوریشن ءَ اندرا آنہی ارتکاز اث ۔ پر، آں ھمنگا چڑ واے حد ءَ دَہ اث دھماں حد ءَ کہ آں ھواں کلاس ءِ ریاست اث ، آنہی ءَ کہ وث وتی زمانغا پہ سجہ ایں سماج ءَ یکیں ترجمانی کث : قدیمیں زمانغ ءَ آں غلام داریں سیٹیز نانی ریاست اث ، مڈل ایجز ءَ اندرا فیوڈلیں اشرافیہ ءِ، او مئے جند ءَ زمانغا بورژوازی ءِ ۔ او وختیکہ آخرامس ریاست سجہ ایں سماج ءِ حقیقی نمائندغ ٹھی ، تہ آں وثار بے ضرورت ٹاہینی ۔ آں وختا کہ ھچ ھمنگیں سماجی طبقہ سر نہ بیث کہ آں محکومی اندرا دارغی بی ، آں وختا کہ طبقاتی حاکمی ، او پیداوار ءَ اندرا استیں انارکی چک ءَ وجود ءَ برجاہ دارغا پہ انفرادی سٹرگل ، ھے سٹرگل ءَ ژہ کڑ و بیوخیں تصادم او زیادتی دیر کنغ بنت تہ گڑہ محکومی اندر ءَ دارغا پہ ھچی سر نہ یئے ۔۔۔ ھچ شئے سپیشل ایں جبر ءَ طاقت بزاں ریاست ءَ ضروری کنغ ءَ پہ سر نہ یئے ۔ سری کار کہ شانہی ءَ ریاست واقعی سجہ ایں سماج ءِ نمائندغ ءِ حیثیت ءَ گوں دیم ءَ کیث ۔۔۔ سماج ءَ نام ءَ چکا پیداوار ءَ وسیلہ (میز آف پروڈکشن) ءَ قبضہ مس گرغ ۔۔۔اے ریاست ءِ حیثیت ءَ آنہی آخری آزادیں اقدام دِہ استیں ۔ سماجی سیادیانی اندرا ریاستی مداخلت یک پہ یکی ہر شعبہ اندرا غیر ضرورت بیاناں روث ، او گڑہ ریاست وتی غی مِری ۔ شخصانی حکومت ءَ ھند ءَ چیزانی انتظام ، او پیداواری پراسیس ءِ راہنمائی گیڑت ۔ ریاست ’’منسوخ‘‘ نہ وی بلکہ آں ’’رفتہ رفتہ ای گار‘‘ بیاناں روث ۔ ھے ’’’یک آزادیں عوامی ریاست‘‘ ءَ والا فقرہ ءِ قدر ءِ پیمائش ءَ داث ، ہر دوئیں حوالہ آں ژہ: یک ایجی ٹیشن والا نکتہ نظر ءَ ژہ دراژیں مُدا ئے ءَ داں اشی قابلِ جوازیں گزر ءِ حوالہ ءَ ژہ ، او دوھمی اشی حتمی سائنسی کمی ءِ حوالہ ءَ ژہ ، او، نیز ، نام نہادیں انارکسٹانی اے مطالبہ ءَ پلوا ژہ کہ ریاست بس شفوئی شف منسوخ کنغ بہ بی‘‘ (’’انٹی ڈوھرنگ ۔ سائنس ءَ اندرا لیٹ پیٹ، کہ ایوگنی ڈوھرنگ ءِ تخلیق ایں‘‘ (انٹی ڈوھرنگ ۔ تاک 303۔301، سیمی جرمن ایڈیشن)۔

اے گشغ محفوظ ایں کہ اینگلز ءِ ھے دلیل ءَ گوں، کہ خیال و نظریہ آں ژہ حد ءَ زیات پُریں ، چھڑ و یک نکتہ اے ماڈرنیں سوشلسٹیں پارٹی آنی اندرا سوشلسٹ فکر ءِ یک پکّوئیں بہرے ٹھیثہ ، یعنی اے ، کہ بقول مارکس ریاست ’’رفتہ رفتہ ای گار ءَ بی‘‘ کہ انارکسٹانی اے نظریہ ءَ ژہ باز جُذائیں کہ ریاست ’’منسوخ‘‘ بی ۔ اے حد ءَ داں مارکسزم ءَ اندرا کمی گیشی کنغ ءَ مطلب اشی ءِ داں اپر چونزم ءَ جھل پر بیثغ ایں ۔ پچیکہ اے ’’ورداس‘‘ یک سست ، ہموار او درجہ بدرجہ تبدیلی ءِ ، دِرک او طوفانانی ناسانڑیں ای ءِ ، انقلاب ءِ غیر موجودگی ءِ چھڑ و یک باز مڑاروئیں صورتے پیدا کنت ۔ ریاست ءِ ’’رفتہ رفتہ ای‘‘ ختم بیغ ءِ موجودہ ایں مزں پاندیں ، مقبول ایں تصور ءَ مطلب اغر انقلابا ژہ انکار نہ ایں تو اشی غیر واضح کنغ ضرور استیں ۔

بہر حال ھمنگیں ’’تشریح‘‘ مارکس ازم ءِ حد ءَ زیات کوجھائیں مسخ کنغ ایں ، کہ چھڑ و بورژوازی ءَ پہ فائدہ مندیں ۔ تھیوری لحاظ ءَ اے کلاں ژہ اہم ایں حالت او سوچ و فکر ءَ پہ پرواہ نہ خنغ ءَ بنیاد ءَ چکا ایریں کہ اینگلز ءِ ’’خلاصہ‘‘ دلیل ءَ اندرا ظاہر بیثغنت کہ مادراہی ءَ ایذ اداثغنت ۔

سری ٹوک اشیں کہ ، وتی دلیل ءِ اصُل شروع ءَ ، اینگلز گشی کہ ، پرولتاریہ ریاستی اقتدار ءَ چکا قبضہ کنغ ءَ رند ’’ریاست ءَ ریاست ءَ حیثیت ءَ منسوخ کنت‘‘ ۔ اے اشی معنی ہانی چکا فکر کنغ ءَ واسطا کنغ نہ وی ۔ عامیں صورتا اے یا تو اصل نظر انداز کنغ بی ، یا اے اینگلز ءَ پلوا ژہ ’’ھیگل ای کمزوری‘‘ ءِ فطرت ءَ اندرا چیزے خیال کنغ بی ۔ اصلامس ، ھے لفظ گوئنڈیں ڈول ءَ عظیم ترین ایں پرولتاری انقلاب بزاں 1871 ءِ پیرس کمیون ءِ تجربہ ءَ ظاہر کنت ، کہ ہمانہی بارو ءَ

ما یک مناسبیں ہندے ءَ بازتفصیل ءَ گوں ٹوک ءَ کنوں ۔اصلامس اینگلز ایذا پرولتاری انقلاب ءَ ٹوکا کنغئیں کہ بورژوا ریاست ءَ ''منسوخ'' کنت ، وختیکہ ریاست ءِ ''رفتہ رفتہ گار بیغ'' ءِ لفظ سوشلسٹ انقلاب ءَ ''رند پرولتاری ریاست'' ءِ باقیات ءَ پلوءَ اشارہ ایں ۔ اینگلز ءِ بیان ایں کہ بورژوا ریاست ''رفتہ رفتہ ای گار'' نہ وی، بلکہ پرولتاریہ اشی ءَ انقلاب ءَ دوران ءَ ''منسوخ'' ءَ کنت ۔ ہے انقلاب ءَ رند ہماں کہ رفتہ رفتہ گار بی آں پرولتاری ریاست ایں ، یانیم ریاست ایں۔

دوہمی ٹوک اشیں کہ ریاست یک ''جبر ءِ زیات سپیشل ایں طاقت'' اے۔اینگلز ایذا باز صفائی ءَ گوں ہے شاندار او حدءَ زیات علمی ڈیفی نیشن ءَ داث۔اوہمشی ءَ ژہ اے نتیجہ درکفی کہ بورژوازی پلوءَ ژہ پرولتاریہ ءِ چپیاڑغ ءَ پہ، امیریں چند مردم ملین ایں پورہاتی ایں مخلوق ءِ چپیاڑغ ءَ پہ، ہے سپیشل ایں طاقت''، گوں چپیاڑغ ءِ یک ''سپیشل ایں طاقت'' اے ءَ لازماً بدل کنغ بہ بی کہ پرولتاریہ پلواژہ بورژوازی ءَ چپیاڑتہ بہ کنت (پرولتاریہ ءِ ڈکٹیٹر شپ)۔''ریاست ءِ ریاست ءَ حیثیت ءَ ''منسوخ'' کنغ ئے بالکل ہے مطلب ایں ۔ اے اصل ہماں ''کاروائی'' ایں کہ سماج ءَ پلوءَ ژہ پیداوار ءَ وسیلہ آنی چکا قبضہ ءَ کنت ۔ او اے ظاہریں ٹوکے کہ یک (بورژوا) ''سپیشل ایں طاقتے'' ہندا دوہمی (پرولتاری) ''سپیشل ایں طاقت'' رفتہ رفتہ ای گار بیغ ''ءِ صورت ءَ گپتہ نہ خنت ۔

ریاست ءِ ''رفتہ رفتہ گار بیغ'' ءَ باروا سیمی ٹوک اشیں ،اوحتی کہ ''ریاست ءِ وثی غی مرغ'' ءِ رنگین وتشریحی لفظانی اندرا ٹو کا کناناں اینگلز باز اوشیشی اوقطعی صورت ءَ گوں ہماں زمانہ ءَ حوالہ داث کہ ''سجہ ایں سماج ءَ پلواژہ پیداوار ءِ وسیلہانی سرا ریاست ءَ قبضہ کنغ ءَ'' ژہ رند ءَ کیث ، بزاں سوشلسٹ انقلاب ءَ ژہ رندءِ زمانہ ءِ۔ مارکلاں سمائیں کہ ہماں زمانہ ءَ ''ریاست'' ءِ سیاسی صورت باز مکمل ایں جمہوریت الغ اث۔ پرہے ٹوک یک اپرچونسٹے دماغ ءَ نہ پیہی ،آں کہ بے شرمی ءَ گوں مارکسزم ءَ مسخ کن انت، کہ اینگلز ایذا جمہوریت ءِ ''وثی غی مرغ'' یا ''رفتہ رفتہ ختم بیغ'' ءِ باروا ٹو کا کنغئیں ۔اے سری نغاہ ءَ تہ باز عجب معلوم بی۔ پر اے چھڑو ہمانہاں پہ ناقابل فہم ایں آنہاں کہ ڈیموکریسی دِہ یک ریاستے بیغ ءَ بارہا نہ سوچتہ ، اونتیجتاً اے دِہ ہماں وختہ غائب بی وختیکہ ریاست غائب بی۔ چھڑو انقلاب بورژوا ریاست ءَ'' منسوخ'' کتہ کنت ۔ ریاست عمومی ڈولا بزاں کلاں ژہ مکمل ایں جمہوریت ، چھڑو ''رفتہ رفتہ ای گار'' بیتہ بی۔

چیارمی ۔''ریاست رفتہ رفتہ ای گار ءَ بی'' ءِ وثی مشہوریں بیانا فارمولیٹ کناناں اینگلز یکدم خاص صورت ءَ تشریح ءَ کنت کہ ہے بیان اپرچونسٹ او انارکسٹ دوئینانی خلاف ایں ۔ ہمنگا کناناں اینگلز اے ٹوک ءَ اگھ اگھ ءَ داری کہ ہے بیانا ژہ درکپتغئیں نتیجہ کہ'' ریاست رفتہ رفتہ گار ءَ بی'' ، اپرچونسٹانی خلاف ایں۔

شرط جتہ کیث کہ ہر 10,000 مڑدماں ژہ، کہ ریاست ''رفتہ رفتہ گار بیغ'' ءَ باروا اش کتغش یا پڑھث ایش، 9990 پیلوی ءَ بے خبر انت، یا گیرنئیں نش، کہ اینگلز ءَ ہے نظریہ ءَ ژہ درکپتغئیں وثی نتیجہ آنی رخ چھڑوا نارکسٹانی خلافا اپرنہ خثہ۔او سرا تلغئیں 10، ءَ ژہ 9 ءَ'' آزادیں عوامی ریاست'' ءِ معنے آنی سمانہ ایں، یا اے کہ پچے ہے نعرہ ءَ چکا حملہ ءَ مطلب اپرچونسٹانی چکا حملہ ایں۔ ہسٹری ہمنگا لکھے جی !۔عظیم ایں انقلابی تعلیمات غیر محسوسیں ڈول ءَ ہمنگا مسخ کنغ بنت او مروج ایں فلسٹن ازم ءَ گوں ہم رنگ کنغ بنت۔ انارکسٹانی خلافا اخذ کتغئیں نتیجہ ہزاراں دھکاں دوہرائینے جیثہ ، اے سفک و بازاری بیثہ ، او مخلوق ءِ دماغانی اندرا بازسفک ایں رنگ ءَ پہ بینے جیثہ ،اواشی ءَ تعصب اے ءِ طاقت اختیار کثہ، حالانکہ اپرچونسٹانی خلافا کشتغئیں نتیجہ مژار وکنے جیثہ او ''فراموش'' کنغ بیثہ۔

'' آزادیں انسانانی ریاست'' ہپتا دءِ دِھاگ ءَ اندرا جرمن سوشل ڈیموکریٹانی اندرا یک پروا گرام والائیں مطالبہ اے اث او مشہوریں نعرہ اے اث۔ ہے مشہوریں نعرہ سجہ ایں سیاسی مطلباں ژہ خالی ایں، سوائے اشی ءِ کہ اے جمہوریت ءِ نظریہ ءَ یک شانداریں فلسٹی طرزے ءَ گوں بیان کنت ۔ دھماں حدے کہ اشی ءَ یک ڈیموکریٹک ریپلک اے ٹوک کثہ، دہماں سندھو ءَ اینگلز یک ایجی ٹیشن ای نکتہ نظر ءَ ژہ ''کمڑ وو قتے ءَ داں'' اشی گزر ''جائز'' سمجھغ ءَ پہ تیار بیثہ ۔ پر، اے یک اپرچونسٹ ایں نعرہ اے اث، اے حاطرا کہ اشی معنی نہ چھڑو بورژوا ڈیموکریسی ءِ سنہڑا کنغ ءَ اث بلکنا اشی اندرا ریاست ءَ چکا سوشلسٹ تنقید ءِ سرپد بیغ ءِ ناکامی دِہ استث ۔ ماکپٹلزم ءَ اندرا پرولتاریہ ءَ پہ یک ڈیموکریٹک ریپلک اے ریاست ءِ بہترین ایں صورت گنژغ ءَ حق ءَ اوں ۔ پر، مارا ے شموشغ ءِ ہچ حق نے کہ حتی کہ کلاں زیات ڈیموکریٹک بورژوا ریپلک ءَ اندرا دِہ اجرت ءِ غلامی بازیں مخلوق ءِ تقدیر ٹھیثی ایں۔ مزید اے کہ ہر ریاست مخلومیں کلاس ءِ ''دبائیغ ءَ پہ یک سپیشل ایں فورس اے'' ۔اے خاطرا ہر ریاست '' آزاد'' نئیں او یک ''عوامی ریاستے'' نہ ایں ۔ مارکس واینگلز ءَ ہفتاد ءَ دھاگا وثی پارٹی کامریڈاں گوں دھک مس دھکی اشی وضاحت کثہ۔

پنچمی ، اینگلز ءِ ہے کتاب ءَ اندرا ، کہ ریاست ءِ رفتہ رفتہ گار بیغ ءِ دلیل ہر کس ءَ گیرانت ، ہمشانی اندرا پرتشددیں انقلاب ءِ اہمیت ءَ باروا دِہ یک دلیلے استیں۔اشی تاریخی رول ءِ اینگلز ءِ تجزیہ پُر تشددیں انقلاب ءَ چکا یک سِدھا سدھائیں قصیدہ

اے ٹھی۔ ہے ''کس ءَ گیر نہ ایں''۔ ہے آئیڈیائے اہمیت ءَ بارواماڈرن ایں سوشلسٹ پارٹی ٹوک ءَ دِہ خن انت یا فکر ءَ دِہ نہ خن انت۔ او اے عوام ءَ اندرا آنہانی روزینہ ای پروپیگنڈہ او ایجی ٹیشن ءَ اندرا ہچ رولے پلے نہ خنت۔ اوگڑہ دِہ اے ''ریاست ءِ رفتہ رفتہ ای گاربیغ'' ءَ گوں جذا کنہ نہ ویخیں ڈولے ءَ یک ہم آہنگیں کُل اے اندرا بستی ایں۔

اینگلز ءِ دلیل اشیں:

''۔۔۔۔ تاریخ ءَ اندرا تشدد البتہ اغدہ یک دوہمی کارے کنت (یک بذی ای طاقتے ءَ ژہ علاوہ)، بزاں یک انقلابی کارے، کہ مارکس ءِ لفظاں ،اے ہر کہنیں سماج ءِ دائی ایں کہ یک نوخین اے ءَ گوں لاف پریں نیں۔ بزاں تشدد یک ہمنگیں سندرے کہ شانہی ءَ سماجی تحریک مڑتغیں ،سنگ بیثغیں سیاسی صورتانی اندرا ژہ زوری گزی او آنہاں بھوریں جھوریں ۔ ۔۔۔ ہمشی باروا مسٹر ڈوہرنگ ءَ یک لوزے دِہ نہ گوئشتہ۔ آں چھڑو ساڑتیں ساہی او نارغ ءَ گوں اے امکان ءَ منی کہ استحصال ءَ چکا جکثغیں اکانومی ءِ درٹنغ ءَ پہ تشدد شاید ضروری بی۔۔۔۔ آں گشی کہ بدقسمتی، کہ ہچیکہ تشدد ءِ ہر استعمال ہماں مڑد ءَ حوصلہ ءَ پست کنت آں کہ اشی ءَ استعمال کنت۔ جرمنی اندرا، گشغ ءَ بی کہ اوذ ایک پُر تشدد ایں تصادم اے۔۔۔ کہ بہرحال عوام ءَ چکا مسلط کنغ بی۔۔۔ کم از کم اے فائدہ بیثیں کہ آنہی ءَ ہماں غلامانہ ذھنیت شُشتیں آں کہ سی سالی جنگ ءِ بے عزتی ءَ پذا قوم ءِ ذہنیت ءَ اندرا جیورتہ۔ او ہے مڑدئے بے روحیں، بے تام ایں او سَنٹ ایں طریقہ فکر و ثار تاریخ ءِ کلاں ژہ مزائیں انقلابی پارٹی چکا مسلط کنغہ قیاس ءَ کنت ؟''(تاک 193، سیمی جرمن ایڈیشن، بہر 2، چیارمی چیپٹر ءِ آخر)۔

پُرتشدد ایں انقلاب ءَ چکا ہے قصیدہ کہ اینگلز مستقل صورت ءَ 1878 او 1894 ءِ نیاما بزاں بالکل وثی موث ءِ گھڑی ءَ داں جرمن سوشل ڈیموکریٹانی دلگوش ءَ شیرا آژتہ، شوں ریاست ءِ ''رفتہ رفتہ ای گاربیغ'' ءِ تھیوری ءَ گوں اوار کنہ کیث تا کہ یک سنگل ایں تھیوری اے ٹھی؟۔

عموماً ہے دوئیں eclecticism ءِ مذت ءَ گوں اوار کنغ بنت، بزاں یک بے اصول یا سوفسطائی (sophistic) سلیکشن اے ءَ گوں کہ اوّلی ءِ وث منی اے طریقہ ءَ ژہ (یا اقتدار والایانی خوش کنغ ءَ پہ) وختے یک او وختے دوہمی دلیلے زیرے جی، او اغر زیات نہ تہ، 100 ءَ ژہ 99 صورتانی اندرا '' رفتہ رفتہ گاربیغ'' ءِ آئیڈیا اگھ اگھ ءَ ایر کنغ بی۔ جدلیات گوں eclecticism ءَ بدل کنغ بی۔۔۔۔ اے کلاں ژہ عمومی ایں، کلاں ژہ زیادہ ای پریکٹس ایں کہ مارکس ازم ءِ باروا مروشی ایں آفشل سوشل ڈیموکریٹک لٹریچر ءَ اندرءَ ملی۔ تبادلہ ءِ ہے طریقہ بلاشک کہ نوخین اے نہ ایں۔ اے تہ حتی کہ کلاسیکل گریک فلسفہ ءِ ہسٹری اندرا دہ گندغ بیثغ اث۔ اپر چونسٹ طریقہ ءَ گوں مارکسزم دروغ ثابت کنغ، جدلیات ءَ ہند ءَ eclectisism ایر کنغ عوام ءَ پرامغ ءِ کلاں ژہ اڑزانیں طریقہ ایں۔ اے یک پُر فریب ایں تسلی اے داث؛ چوش محسوس بی کہ پراسیس ءِ سجہ ایں پہناذانی خیال کنغ بیثہ، رذوم سجہ ایں رجحان، سجہ ایں متضادیں اثرانی خیال دارغ بیثہ۔ حالانکہ حقیقتا مس اے سماجی رذوم ءِ پراسیس ءِ ہچ کامل او انقلابی تصورے نہ داث۔

ماہڑزا اول ءَ گوئشتہ، او رندءَ زیات پیلوی ءَ ڈسوں، کہ یک پُرتشددیں انقلابے ءِ لازمی بیغ ءَ بارو امارکس واینگلز ءِ نظریہ ءِ تعلق گوں بورژوا ریاست ایں ۔ ریاست ''رفتہ رفتہ گاربیغ'' ءِ پراسیس ءَ گوں یک پرولتاری ریاست (پرولتاریہ ءِ ڈکٹیٹرشپ) اے اندرا تبدیل کنہ نہ بیئے۔ پُرعمومی قانون ءَ صورت ءَ، چھڑو یک پُرتشددیں انقلابے ءَ گوں بدل کنہ کیث۔ اینگلز ءَ اشی شانا کہ قصیدہ ای سوت گوئشتہ، او آں کہ مارکس ءِ دھک مس دھکی بیاناں گوں بالکل مشابہت ءَ داری (گندیں ''فلسفہ ءِ نیز گاری'' ءَ او ''کمیونسٹ مینی فیسٹو''، ءِ آخری پیراگرافاں کہ فخر ءَ گوں یک پُرتشدد ایں انقلاب ءِ ناگزیریت ءَ گوانک چیکی اعلان ءَ کنت؛ گنداں کہ مارکسا قریباً 30 سال رند ءَ 1875 ءِ ''گوتھا پروگرام'' (4) ءَ چکا تنقید ءَ اندرا چے لکھثہ، او ذکہ آنہی ءَ ہماں پروگرام ءِ اپر چونسٹ ایں کردار ناترسی ءَ گوں ملامت کثہ)۔ اے قصیدہ ہچ صورت ءَ چھڑو یک ''جوش'' اے نئیں، چھڑو یک جذباتی تقریرے یا یک مناظرہ والی جھٹ جھمب اے نئیں۔ پُرتشددیں انقلاب ءِ ہے او بالکل ہے خیال ءَ گوں عوام الناس ءِ باقاعدہ ای ءَ فیض یاب کنغ ءِ ضرورت مارکس واینگلز ئے دراہیں نظریہ ءِ بنیاد یں۔ مڑشی جاری ایں سوشل شاونسٹ او کاؤتسکی ءِ رجحانانی مارکس واینگلز ءِ نظریہ ءَ گوں غداری ءِ اظہار اَکّیلائی ءَ اے ٹوک ءَ گوں بی کہ ہے دوئیں رجحانانی اندرا ہمنگیں پروپیگنڈا او ایجی ٹیشن نظرانداز کنغ ءَ بیث۔

پرولتاری ریاست ءَ پلواژہ بورژوا ریاست ءِ چیتاڑغ یک پُرتشددیں انقلابے ءَ بغیر ناممکن ایں۔ پرولتاری ریاست ءِ منسوخی بزاں، عمومی صورت ءَ ریاست ءِ منسوخی بغیر ژہ ''رفتہ رفتہ ای گار بیغ'' ءِ پراسیس ءَ گزغ ءَ ناممکن ایں۔

مارکس واینگلز ا ہے خیالانی ٹھوس او مفصل ایں وضاحت ہماں وختا داثہ کہ آنہاں ہر خاصیں انقلابی صورتحال ءِ مطالعہ کثہ، ہر خاصیں انقلاب ءِ تجربہ آنی سبقانی تجزیہ کثہ۔ نیں ہماں پلو ءَ کاؤں آں کہ بلاشک آنہانی نظریہ ءِ کلاں ژہ ضروری بہرایں۔

ریفرنسز

1. فیبین: فیبین سوسائٹی ئے ممبر۔اے برطانوی اصلاح پسندیں تنظیمے اث کہ 1884 ءَ ٹھیشہ۔اشی نام رومئے کمانڈر فیبی میکسم ءَ ژہ زیرے جیتہ۔آنہیا یئی بالہ اُڑدانی (دیمو دیمیں جنگا ژہ پاریزتیا) ثر میینغہ حکمتِ عملی کثغث ۔اے سوسائٹی ممبر موڑی سر بورژوا دانشور اشث ۔ اشاں پرولتاریہ ئے طبقاتی جدوجہد او سوشلسٹ انقلابہ ضرورت نہ من اِث ۔ آنہاں کستریں اصلاحاں گوں کپٹلزمئے سوشلزمہ لافا بدل کنغا پہ زور پر ینت۔لینن ءَ گوشتہ: ''اے بازگیغ گنداوا پر چونسٹ ایں نظریہ اے اث''۔فیبین سوسائٹی 1900 ءَ لیبر پارٹیا اوار بیثہ۔

2. سوشلسٹ ریولیوشنری پارٹی

سوشلسٹ ریولیوشنری پارٹی روس ءِ پیٹی بورژوا پارٹی اث کہ 1901 ءِ آخر ءَ او 1902 ءِ شروع ءَ بازیں نرودنک گروپانی اوار بیغ ءَ گوں پیدا بیثہ۔اولی جہانی جنگ ءِ سالاں سوشلسٹ ریولیوشنری سوشل شاونسٹ بیثغ انت۔

1917 ءِ فروری ءِ بورژوا ڈیموکریٹک انقلاب ءَ رند ءَ سوشلسٹ ریولیوشنری منشویکاں گوں اوار بیثغنت او انقلاب دژمنیں بورژوا فیوڈل عبوری حکومت ءِ پلہ بند بیثغنت ۔او آنہانی لیڈر کیرنسکی ،او کسین تیف او چیرنوف ہے حکومت ءَ شریخ بیثغ انت۔سوشلسٹ ریولیوشنری پارٹی ءَ راہکانی اے مطالبہ منغ ءَ ژہ انکار کثہ کہ فیوڈلزم ختم کنغ بہ بی۔عبوری حکومت ءَ اندرا سوشلسٹ ریولیوشنری وزیراں ہماں راہکانی خلافا فوج دیم داثہ ہمانہاں کہ جاگیردارانی ڈغارانی چکا قبضہ کثہ۔

درملکی جنگی مداخلت او خانہ جنگی ءِ سالاں سوشلسٹ ریولیوشنری آں انقلاب دژمنیں تباہ کنوخیں کار کثغنت ۔ رائٹ گارڈانی حمایت کثہ ، انقلاب دژمنیں سازشاں بہرزثہ او سوویت ریاست او کمیونسٹ پارٹی ءِ ورکرانی خلافا ٹیرراسٹیں کاروائی کثغنت۔

3. مانشوزم: روسی سوشل ڈیموکریسی اندرا کلاں ژہ مزائیں موقع پرستیں نظریہ۔مزدور طبقہ اندرا بورژوا اثرانی آروخ۔مانشویکاں اے نام اگست 1903 ءِ روسی سوشل ڈیموکریٹک لیبر پارٹی ءِ دوہمی کانگریس ءَ اندرا ہماں وخت ءَ ملثہ وختیکہ آں کانگریس ءِ آخر ءَ پارٹی ءِ ادارہانی الیکشن ءَ اندرا اقلیت بیثغنت او انقلابی سوشل ڈیموکریٹ لینن ءِ سروکی ءَ اکثریت ءَ بیثغ انت ۔گڑہ بالشویک (اکثریت) او مانشویک (اقلیت) ءِ نام کپتغ انت۔

مانشویک بورژوازی ءَ گوں پرولتاریہ ءِ صُلح ءَ باڑا بیثت ۔آنہاں مزدور تحریک ءَ اندرا اپرچونزم چلائینت ۔فروری 1917 ءِ بورژوا ڈیموکریٹک انقلابا رند منشویک سوشلسٹ ریولیوشنری آں بچی ءَ عبوری حکومت ءَ اوار بیثغ انت او اُبھرخیں پرولتاری انقلاب ءَ خلافا کارکثیش۔اکتوبر سوشلسٹ انقلابا رند منشویک گوانک چیکی انقلاب دژمنیں پارٹی ٹھیثہ۔

4. گوتھا پروگرام: جرمنی ءِ سوشلسٹ لیبر پارٹی پروگرام کہ 1875 ءَ اندرا ہے دوئیں جرمن سوشلسٹ پارٹیانی گوتھا کانگریس ءَ اندرا منظور کنغ بیثہ کہ ہماں وختاں جدا جدا اشنت او ہے کانگریس ءَ اندرا پوثاں اوار بیثغ انت۔اے پارٹی اشنت: ائیزیناخ والایانی (کہ لیڈر ببیل او ولیہم ۔لب نخت اشنت او اے مارکس ءَ خیالاں ژہ متاثر اشنت ۔پروگرام ءَ اندرا بازیں خیال گڈ مُڈ اشنت او آں اپرچونسٹ این اث پچیکہ بازا ہمیں مسئلہ آنی چکا ائیزناخ والایاں لاسال ءِ حامیاں باز رعایت داثہ او آنہانی فارمولا منظور کنغ انت۔کارل مارکسا وتی کتاب ''گوتھا پروگرام ءِ تنقید'' او اینگلز ءِ ببیل ءِ نام ءَ چھٹی (28-18 مارچ 1875) ءَ گوتھا پروگرام ءِ مسودہ سراسخیں تنقید کثہ او اے 1869 ءِ ائیزیناخ والایانی پروگرام ءِ مقابلہ ءَ بازپذ گڑدی گوشتہ۔

جبلت

آمنہ ابڑو

اور۔۔مجھے حفاظت کے نام پر،
بس نظر بھر محدودیت میں
قید کر دیا گیا،
اور ڈر، بےیقینی اور شک کی
تہہ در تہہ،
چادروں میں چھپایا گیا
دھیرے دھیرے آنکھیں
روشنی سے ڈرنے لگیں۔
اظہار کی خواہش بھی
برہنگی کی سعی سی
لگی۔۔اور
مسلسل قید کی عادت نے
جینا آسان کر دیا
بہت آسان۔۔
بس ذرا اک زندہ لاش کی طرح
رینگنا اور سانس لینا۔۔بس
اور بس۔۔۔
تو پھر۔۔خموشی سے،
لہو میں زندگی کی خواہش جیسی
یہ کھلبلی سی
کہاں سے سرک آئی ہے۔۔
خواہش کہ۔۔۔۔
جینا ہے۔۔جی کر دیکھنا ہے
آہ۔۔
آزادی کی تمنا
میری جبلت میں
شامل ہے۔

ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ

ڈاکٹر ضیاء الرحمن بلوچ

کوئی بھی شخص ہو، جو کسی بھی شعبہ زندگی سے منسلک ہو اُس کے قصرِ زندگانی کی تعمیر و تشکیل میں کسی نہ کسی استاد کا دستِ معجز نما ضرور شامل رہا ہے۔ زمانے کی ترقی و ترویج اور انسانوں کو زمین سے آسمان کی سیر کروانے اور چاند تک پہنچنے کی اس ساری جدوجہد کے پیچھے استاد ہی کارفرما رہے ہیں۔ انہی معاشروں نے ترقی کی جنھوں نے اپنے مشاہیر اور استادوں کی قدر کی اور وہی طالب علم کامیابی سے سرشار ہوئے جو استادوں کی عظمت وعزت سے واقف تھے۔ راقم کا شمار بھی ایسے ہی طالب علموں میں ہوتا ہے، جسے مختلف اساتذہ کرام کی زیرِ نگرانی سیکھنے کا موقع ملا اور اس نے اپنے اساتذہ کے فیضانِ نظر سے کسبِ ضیا کیا۔ تمام اساتذہ میرے لیے روشنی کا مینار ہیں جنھوں نے راقم کی علمی و ادبی حوالے سے سرپرستی کی اور صحیح معنوں میں میری آبیاری کی۔ انہی قابلِ احترام اساتذہ میں میرے قابلِ فخر اور ہمہ پہلو استاد اور راہ نما ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ بھی ہیں۔ یہ 23 سال پہلے کی بات ہے جب میں بی اے کے بعد ایک نجی سکول میں بطور استاد فرائض سرانجام دے رہا تھا اور ریڈیو اور پی ٹی وی سے منسلک تھا۔ ایک دن پی ٹی وی کے پروڈیوسر نے کہا کہ اگر آپ بلوچی میں ایم اے کر لیں تو پی ٹی وی میں اسسٹنٹ پروڈیوسر کی آسامیاں نکلنے والی ہیں، ایم اے بلوچی کے بعد آپ درخواست دینے کے اہل ہوں گے، اس حوالے سے مجھے شعبہ بلوچی، جامعہ بلوچستان جانے کا مشورہ دیا۔

اگلے دن میں تقریباً 11 بجے شعبہ بلوچی پہنچا، وہاں معلومات کے بعد مجھے ایک کمرے میں بھیجا گیا۔ اجازت لینے کے بعد جب میں اندر گیا تو دیکھا کہ ایک کشادہ پیشانی، گھنے سیاہ بالوں، چہرے کی خوبصورتی میں چار چاند لگائے ہوئے کالی مونچھیں، روشن آنکھیں، خوش لباس، شاداب چہرے کے ساتھ ایک شخص براجمان ہے۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی، انتہائی محبت اور شفقت سے جب وہ محوِ گفتگو ہوئے تو میں انگشت بدنداں رہ گیا کہ پہلی ملاقات میں کوئی اتنا بھی شفیق ہو سکتا ہے؟ یقیناً ایک اچھے استاد کی یہی پہچان ہے۔ یہ ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ تھے۔ وہ دن اور آج کا دن انھوں نے کتابیں عنایت کیں، ایم اے بلوچی کروایا اور میرا اوڑھنا بچھونا، بلوچ، بلوچی اور بلوچیت ہے تو یہ سب اُن کی حوصلہ افزائی اور سمت نمائی کا کرشمہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ بلوچی علم و ادب کے اہم مرکز کیچ کے علاقے آبسر میں عبدالخالق کے گھر 15 دسمبر 1967 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کیچ میں حاصل کی۔ 1983 میں گورنمنٹ ہائی سکول کیچ سے میٹرک 1985 میں گورنمنٹ ڈگری کالج تربت (موجودہ عطاشاد کالج) سے ایف ایس ای کی سند حاصل کی، جامعہ بلوچستان سے 1988 میں بی اے اور 1993 میں ایم اے بلوچی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

صبور بلوچ نے 2002 میں جامعہ بلوچستان سے جدید بلوچی شاعری کے سرخیل میر گل نصیر پر تحقیقی کام کر کے ایم فل کی تکمیل کی۔ یہ گل خان نصیر پر پہلی سندی تحقیق تھی۔ آپ نے 2009 میں ''بلوچی کسہی لبزانک'' کے موضوع پر جامعہ بلوچستان سے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب کی زیرِ نگرانی پی ایچ ڈی کا مقالا لکھا اور سندِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پی ایچ ڈی کی سطح پر بلوچی میں لکھا گیا یہ پہلا مقالہ تھا۔

بطور استاد آپ نے اپنے کیریئر کا آغاز یکم جنوری 1994 کو شعبہ بلوچی میں بطور لیکچرار کیا اپنی لگن اور محنت سے 2004 میں اسسٹنٹ پروفیسر جبکہ 2008 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر اور 2011 میں پروفیسر کے منصب پر متمکن ہوئے۔ اس مدت ملازمت کے دوران میں آپ دو مرتبہ تین تین سال کے لیے شعبہ بلوچی کے صدر نشین رہے جبکہ مزید براں جینڈر اینڈ ڈویلپمنٹ شعبہ کی سربراہی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ ڈاکٹر صبور بلوچ 12 جون 2013 کو جامعہ تربت کیچ کے پرووائس چانسلر تعینات ہوئے اور 2016 تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد تا حال جامعہ تربت کیچ میں بطور ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف بلوچی لینگویج اینڈ کلچر اور ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز اینڈ ہیومینیٹیز کے عہدے پر تعینات ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ نے علمی ادبی دنیا میں بطور مترجم، کالم نگار، افسانہ نگار، محقق اور ادیب شہرت حاصل کی اور ان متعدد شعبوں میں ایسے کارنامے انجام دیے جن سے ان شعبوں کے وقار میں اضافہ ہوا۔

اگرچہ بلوچی افسانے کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے مگر بلوچی ادب میں اگر کسی ادبی صنف نے دوسری اصناف کی نسبت زیادہ ترقی کی ہے تو وہ بلوچی افسانہ ہے۔ بلوچی افسانہ نگاروں کی فہرست اگرچہ طویل ہے مگر نمایاں تر نام بہت تھوڑے ہیں، جن میں ایک جگمگاتا نام ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ کا بھی ہے

ترجمہ ایک مشکل فن ہے جس کے لیے دونوں زبانوں کو سمجھنا اور جس تخلیق کا ترجمہ کیا جارہا

ہے،تخلیق کار کی سوچ،فکر اور اس وقت کے حالات و واقعات سے آگاہی کے بغیر یہ کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ بطور مترجم آپ بلوچی کے صف اول کے ترجمہ نگاروں میں شامل ہیں،اس بات پر ہمارے سارے ناقدین،محققین متفق ہیں آپ نے مختلف زبانوں کے افسانے تراجم کیے ہیں

بلوچی میں بطور خاص ادبی کالم نویسی کی روایت اتنی توانا نہیں ہے مگر پھر بھی بہت نامور کالم نویس پیدا ہوئے ہیں، جن میں ایک نام ڈاکٹر عبدالصبور بلوچ کا بھی ہے، جنھوں نے روزنامہ کو ہستان، کوئٹہ کے ہفتہ وار میگزین میں یکم اپریل 2001 کے شمارے اپنے کالم نویسی کے سفر کا آغاز کیا اور مختلف موضوعات پر کالم لکھتے رہے۔ اس کے بعد 2004 میں روزنامہ آساپ کوئٹہ کے لیے ادبی کالم لکھتے رہے۔ اسی طرح مئی 2015 میں'' آتار'' کے عنوان سے روزنامہ مشرق کوئٹہ میں ادبی کالم لکھے۔

کسی بھی زبان کی ترقی وترویج میں تحقیق و تنقید کا بڑا اہم کردار ہے۔ زبان وادب کے ارتقا اور ترقی و ترویج میں محققین اور ناقدین کے کردار سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔ یہ زبان اور اس کے ادب کو مضبوط بنیادیں فراہم کرتی ہیں گو کہ یہ ایک مشکل کام ہے مگر زبان کی نئی وسعتوں اور بلندیوں تک پہنچانے کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ بلوچی تحقیق وتنقید میں اہم نام ہیں، تحقیق وتنقید کے حوالے سے آپ کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں'' شرک وپال'' 1999، بلوچ عورت 2001، ورثہ نصیریات 2005 کہنین بلوچی شاعری 2006 (آغاز و ارتقا) بلوچی قصہی لبزانک (تحقیقی وتنقیدی مطالعہ) 2009 شامل ہیں

اسی طرح 2015 میں'' نوکیں عہد و بلوچی زبان لبزانک و دودور بیدگ'' جو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے شائع ہوا۔ اسی طرح انسٹی ٹیوٹ آف بلوچی لینگوئج کلچر جامعہ تربت سے 2018 میں بلوچی پٹ پولی تاک بندانی اشاریہ، 2020 میں ڈیوا اور 2020 میں دوسری کتاب'' گالبند زانتی وبلوچی گالبند'' شائع کروایا۔ مذکورہ بالا تمام تحقیقی وتنقیدی کتابیں مختلف جامعات کے نصابات کا حصہ ہیں اس کے علاوہ تحقیق وتنقید کے حوالے سے مختلف موضوعات پر ملک کی مختلف تحقیقی وتنقیدی رسائل وجرائد میں اب تک آپ کے 40 مقالہ جات شائع ہو چکے ہیں۔

اُن کی زیر نگرانی اب تک 16 طالب علموں نے اپنا ایم فل مکمل کیا ہے جبکہ 4 ریسرچ اسکالر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔

آپ ایک کثیر الجہت شخصت کے مالک ہیں، ایک اچھے استاد کے ساتھ ساتھ ایک اچھے منتظم بھی ہیں۔ آپ نے بلوچی اکیڈمی کوئٹہ شعبہ بلوچی جامعہ بلوچستان، انسٹی ٹیوٹ آف بلوچی لینگوئج اینڈ کلچر جامعہ تربت، بلوچستان اکیڈمی اور دیگر علمی وادبی اداروں میں 25 سے زائد سیمی ناروں، ورکشاپوں اور کانفرنسوں کا نعقاد کیا ہے علاوہ ازیں 46 ملکی و بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنسز میں بلوچی، اردو اور انگریزی میں تحقیقی وتنقیدی مقالات پیش کر چکے ہیں۔ آپ 80 سیمینارز اور کانفرنسز میں بلوچی اور بلوچستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔

آپ نے اب تک مختلف ملکی و بین الاقوامی علمی وادبی اداروں کے 8 بڑے بڑے تحقیقی منصوبے مکمل کیے ہیں جن میں مست توکلی اور صوفی ازم، بلوچستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ بلوچستان، بلوچ کہنین شاعری، ہائر ایجوکیشن کمیشن، پاکستان۔ بلوچی معاشرے میں عورت کا کردار یونیسف، اقوام متحدہ، بین الاقوامی لغات کا منصوبہ میری لینڈ یونیورسٹی امریکہ، بلوچی ادب اور تراجم ہائیر ایجوکیشن کمیشن پاکستان اور اسی طرح جامعہ تربت کا تحقیقی منصوبہ ''توہم پرستی اور اس کے منفی اثرات'' مکمل کر چکے ہیں۔

اپنی علمی وادبی استعداد کار اور صلاحیتوں کی بدولت آپ 13 ملکی اور بین الاقوامی تحقیقی مجلوں کی ایڈیٹوریل اور ایڈوائزری بورڈز میں شامل ہیں، جس میں تحقیق مجلّہ، میری، ہینکین، بلوچستان ریویو، بلوچستانیات، پولی گلاٹ، ال باھی، ساسا کلمت بلوچی شامل ہیں، اس علمی وادبی معاونت کے ساتھ ساتھ آپ مختلف جامعات اور اداروں کی سلیکشن بورڈز، فنانس کمیٹی، ایگزیکٹیو باڈی، سینڈیکیٹ بورڈ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی اور بورڈ آف گورنرز کے علاوہ دیگر کئی اداروں اور بورڈز میں بطور ممبر کام کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صبور بلوچ نے 2015 میں چیئرمین شعبہ بلوچی کی حیثیت سے جب ذمہ داری سنبھالی تو انھوں نے پہلی مرتبہ بلوچی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کا آغاز کیا یہ ایک ایسی کاوش تھی جس کی کمی کافی عرصے سے محسوس کی جارہی تھی۔ یوں آپ نے 2009 میں پہلا بلوچی تحقیقی مجلّہ ھنکین بھی شروع کیا جو بلوچی تحقیق وتنقید کی جانب ایک اہم پیش رفت تھی۔ اسی طرح بلوچی کا پہلا نیوز لیٹر'' سال حال'' بھی آپ کی محنت کا ثمر ہے۔ اس دوران مختلف کالجوں میں فارسی بطور اختیاری مضمون کے طور پر شامل تھا آپ کی کوششوں سے کالجوں میں بلوچی کا بھی آغاز ہوا اور اس کے علاوہ 2 سو نمبروں کا بلوچی پیپر کا آغاز بھی آپ کے سر ہے۔ جس سے کالجوں میں بلوچی کی اساتذہ کی بہت سی آسامیاں در آئیں۔ اس کے علاوہ میر گل خان نصیر چیئر کی بنیاد بھی آپ نے ڈالی۔ علاوہ ازیں جب تربت یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو آپ پہلے پرووائس چانسلر بنے اس دوران میں آپ نے انسٹی ٹیوٹ ا?ف بلوچی لینگوئج اینڈ کلچر کی داغ بیل ڈال دی جواب ایک مکمل فعال ادارہ ہے، جہاں بی ایس بلوچی، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کی تعلیم دی جارہی ہے۔

دُعا ہے کہ یہ شجر اسی طرح سرسبز وشاداب رہے اور علم وادب کے مسافر اس کی گھنیری اور ٹھنڈی چھاؤں سے مستقلاً لذت گیر ہوتے رہیں۔

استاد امام الدین صلاحی بلوچ

میر بلوچ خان

(رباب کے نابغہِ روزگار اور قد آور استاد)

زمانہ قدیم سے بلوچوں میں موسیقی اور ساز سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہر قبیلے کے الگ الگ موسیقار اور گویے مختص تھے۔ ان قبیلوں میں موسیقی کی محافل رات گئے تک سجتی اور جمتی تھیں۔ ریاست کلات کے دور میں خان کے دربار میں کئی خوش گلو، موسیقار اور شعرا کے علاوہ وہ آلات جراحی ، زرعی آلات اور کئی شعبے کے لوگ وابستہ تھے۔

مشہور موسیقار اور رباب نواز سخی احمد خان صلاحی بلوچ خان آف قلات کے دربار سے وابستہ تھا اور خان بھی موسیقی کی تعلیم ان سے سیکھتا تھا ، خان خدائیداد خان کا نعرہ ''محمود خانی'' کے خوبصورت طرز بھی رباب کی آواز میں بجایا جاتا تھا۔ بنیادی طور پر اس دھن کو پریڈ سونگ کہا جاتا تھا۔ اس پریڈ سونگ کی موسیقی بھی موسیقار سخی احمد خان صلاحی نے ترتیب دی تھی۔ اس کے علاوہ خان خدائیداد خان کے دیوان خاص میں جب موسیقی کی محفل سجتی تھی تو سخی احمد خان اپنی رباب کی عمدہ اور خوبصورت دھنوں میں خان صاحب کی دیوان کو چار چاند لگاتے تھے۔

برصغیر کے مشہور و معروف موسیقار اور رباب نواز استاد امام دین صلاحی خان خدائیداد خان کے دربار سے وابستہ موسیقار اور رباب کے استاد سخی احمد خان صلاحی کے بیٹے تھے۔ جن کی پیدائش 1901 میں قلات کے سبزہ گزار قصبہ منگوچر میں ہوئی۔ 1948 میں ریاست قلات کی پاکستان میں شمولیت سے پہلے یہ خاندان کوئٹہ کے لوہاری محلے گلی نمبر انیچاری روڑ میں شفٹ ہوگیا۔

استاد سخی احمد خان کے دو بیٹے تھے، کریم بخش صلاحی اور امام دین صلاحی ۔لیکن امام دین صلاحی نے رباب کی موسیقی کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔ رباب کے نابغہ روزگار استاد امام دین صلاحی کی دو بیویوں میں سے چار بیٹے تھے، ان کے نام یاسین صلاحی ، یامین صلاحی ، عبدالمنان صلاحی اور صلاح الدین صلاحی ہیں۔

صلاحی قبیلے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ قبیلہ بنیادی طور پر بلوچوں کے میروانی قبیلے کی ایک شاخ ہے۔ اس قبیلے کے لوگ ایرانی بلوچستان کے علاوہ خاران ، واشک ، سوراب ، قلات ، منگوچر کے علاوہ سندھ کے بہت سارے علاقوں میں آباد ہیں۔ یہ لوگ موسیقی کے علاوہ ہنرمند لوگ ہیں اور کئی صدیوں سے خان آف قلات کے ریاستی امور میں خدمات سر انجام دیتے تھے۔ یہ خاندان خان میرو خان دہم کے صلاحی خان سے نسبت رکھتے ہیں۔ یہ شجرہ اب بھی قلات کے شاہی دربار میں موجود ہیں۔ ان کے پدری میراث اور مال ''کلی زرد غلام جان منگوچر'' قلات میں موجود ہیں۔ اور کلی زرد میں ان کی اچھی خاصی آبادی بھی ہے۔ صلاحی قبیلہ اس وقت بھی موسیقی کے علاوہ کاروبار، ملازمت اور کاریگری کے فن سے وابستہ ہیں اب ان کے لوگ سرکاری ملازمت کی وجہ سے فن موسیقی سے دور ہیں۔

جب ریاست قلات کے دربار سے وابستہ نامی گرامی ارباب نواز استاد سخی احمد خان صلاحی قیام پاکستان سے قبل کوئٹہ شہر میں منتقل ہوئے تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں امام دین صلاحی اور کریم بخش صلاحی کو موسیقی اور خاص رباب کی تعلیم گھر پر دلوادی۔ کریم بخش صلاحی رباب کے استاد نہیں بن سکے، البتہ استاد امام دین صلاحی اپنے والد سے بھی آگے نکل گئے۔

جب 1956 میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا افتتاح ہوا تو ریڈیو پاکستان کے افتتاحی جشن میں امام الدین صلاحی نے بہتر انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور یوں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ریڈیو سے وابستہ رہے۔

ریڈیو پاکستان میں ان کے خاص دوست فیض محمد بلوچ، مرید بلیدی، محمد جمن، عید محمد علی، کریم بخش پیرنا اور کئی احباب تھے۔ ان کے خاص شاگردوں میں ان کے بیٹے یاسین صلاحی ، سلطان محمد چانئ، امیر بخش مینڈ اولین، گل محمد، محمد وارث اور انور قادری شامل تھے۔ انہوں نے یوسف اور شہر بانو کی پشتو فلم ۔۔۔ کی دھن تیار کی تھی اور پورے فلم میں ان کی رباب کی آواز شامل ہے۔

سنگیت کی ماں لتا منگیشکر کی مشہور و معروف گیت '' پنکھ ہوتی تو اڑآتی رہے'' جو 1962 میں ہندوستان میں ریکارڈ ہوئی تھی اس کی رباب نوازی اور موسیقاری کی شرف بھی استاد امام دین صلاحی کو حاصل ہے۔

اس کے علاوہ دلیپ کمار کی فلم '' گنگا جمنا'' کے اکثر موسیقی استاد نے ترتیب دی تھی۔ پاکستان سے قبل وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔ کراچی، لاہور اور دہلی سے ان کی سولو ریکارڈنگ نشر ہوتی تھیں۔ وہ کئی بار ہندوستان گئے اور کئی فلموں کی موسیقی میں ان کی رباب کی طرز اور دھن شامل ہے۔ انہوں نے پی آئی اے اکیڈمی میں ملازمت کی اور ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی میں تادم عمر وابستہ رہے۔

بلوچی کے مایہ ناز استاد مرید بلیدی کے اکثر بلوچی گیتوں کے طرز نگار بھی رہے۔ پنڈت روی شنکر اور استاد امام دین صلاحی ہم شیر بھائی تھے۔ یہ دونوں استاد علی اکبر خان سرود نواز کے شاگرد خاص

تھے۔ وہ بمبئی شہر میں وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہے اور کئی دفع ان سے ملتے رہے۔

وہ پاکستان فلم انڈسٹری سے بھی وابستہ رہے، پاکستان کے مشہور گلوکاروں جن میں مہدی حسن ، فریدہ خانم ، اقبال بانو، رونا لیلیٰ ، نور جہان ، استاد امانت علی خان ، استاد فتح علی خان کے ساتھ نہ صرف سنگت کرتے تھے بلکہ ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔

وہ نواب اکبر خان بگٹی کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ جنہوں نے کئی بار بلوچستان آرٹس کونسل میں اپنی رباب کے تار چھیڑ دیے، نواب صاحب بھی وہاں مہمان خاص کے طور پر شامل تھے۔ نواب صاحب موسیقی کے بہت بڑے دلدادہ تھے۔ ان کو مرید بلیدی کی آواز اور استاد امام دین صلاحی کے رباب کی آواز بے حد پسند تھی۔

افغانستان میں رباب کے مشہور استاد محمد عمران کے قریبی دوستوں میں شامل تھے جب وہ افغانستان گئے اور ان کے ہاں رہائش کیا کرتے تھے۔ ظاہر شاہ کے دور میں شاہی دربار میں رباب کا ایک مقابلہ ہوا تو اس میں استاد امام دین صلاحی بھی شامل تھے تو انہوں نے اپنی خوبصورت انداز میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور سب سے بازی لے گئے۔ اس کے عوض شاہ افغان احمد شاہ نے اپنا چغہ نکال کر بطور تحفہ اسے پیش کیا۔ یہ چغہ ایک قومی میراث کے طور پر کئی عرصے تک ان کے گھر میں محفوظ رہا لیکن بعد میں ان کی رحلت کے بعد زمانہ حاضر کے مشہور لوک گلوکار استاد اختر چنال نے اسے طلب کیا تو اس کو استاد امام دین کے بیٹے محمد یامین صلاحی نے تہہ دل سے پیش کیا۔

رباب کے بارے میں لوگوں کی مختلف قیاس آرائیاں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک روسی ساز ہے، کچھ کا کہنا ہے کہ یہ ساز افغانستان میں متعارف ہوا اور کچھ لوگ اس کو عربوں کا ساز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اصل میں اس ساز کو شہرت افغانوں نے دی تھی اور یہ ساز ملکِ افغانستان میں قومی ساز کی حیثیت سے منظر عام پر آئی۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی سمجھتا ہوں کہ اس ساز میں استاد امام دین صلاحی جدت لائے اور اس کو پانچ سروں کا ساز بنا دیا۔ اور اس کو پہلی دفعہ امام دین صلاحی نے کلاسیکل موسیقی کی صف میں پورے برصغیر میں متعارف کروایا۔ راگ ''بہادر کھونس'' کے مشہور راگوں کو استاد امام دین صلاحی نے کروایا جو آج بھی ریڈیو پاکستان کے میوزیکل آرکائیوز میں موجود ہے۔

راگ ''بہادر کھونس'' استاد امام دین صلاحی کی ایجاد ہے۔ اُس دور میں یہ بحث چڑھ گئی تھی استاد امام دین نے ایک خود ساختہ راگ ترتیب دی ہے اور اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کے بعد ملک کے بے شمار موسیقاروں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اس راگ کا وجود ہے۔

استاد امام دین صلاحی نے اپنی زندگی میں حج اور عمرہ بھی ادا کیے وہ نماز اور صوم وصلات کے خاص پابند تھے۔ لیکن وہ ترقی پسند اور آزاد سوچ کے مالک تھے موسیقی ان کی رگ رگوں میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو بھی موسیقی کی تعلیم دیتے تھے ان کے بچوں نے بڑے احسن طریقے سے موسیقی کی تعلیم سیکھی۔

محمد یاسین صلاحی ان کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ 1946 میں کراچی کے علاقے گزری میں پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ کچھ عرصے کے لیے وہ کراچی کے علاقے گزری میں منتقل ہوئے تھے اور وہاں ان کے بیٹے یاسین صلاحی پیدا ہوئے۔ پھر 1947 میں دوبارہ کوئٹہ کے نیچاری روڑ میں واپس آگئے اور کوئٹہ میں مستقل طور پر رہائش پزیر ہوگئے۔ اس زمانے میں ان کے کچھ رشتہ دار بمبئی چلے گئے اور وہاں بھی پتھروں اور آرائشی کاموں میں مشغول ہوگئے۔

ان کے بیٹے یاسین صلاحی ریڈیو پاکستان، پاکستان ٹیلی وژن اور ادارہ ثقافت کے قومی پروگراموں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اوجڑی کیمپ میں موسیقی کا ایک بڑا جلسہ ہو رہا تھا اور ایک وہاں ایک بڑا دھماکہ ہوا۔ اس موسیقی کی محفل میں استاد امام دین صلاحی کے بیٹے یاسین صلاحی بھی شامل تھے۔ جو شدید زخمی ہوئے۔

استاد امام دین صلاحی کا یہ موسیقار بیٹا 6 نومبر 1989 کو فوت ہوگئے اور ان کا مزار کوئٹہ کے مشہور قبرستان کاسی قبرستان میں ہے۔

استاد امام دین صلاحی کے بیٹے یاسین صلاحی اور یامین صلاحی کے بعد رباب نوازی کا یہ فن ختم نہیں ہوا۔ بلکہ یامین کے بیٹے محمد بلال اور امام الدین (دوم) نے اس فن کو زندہ رکھا ہے۔ لیکن ریڈیو، ٹی وی اور حکومت اور عوامی حلقوں میں پزیرائی اور دلجوئی نہ ہونے کی وجہ سے وہ مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں۔

استاد امام دین صلاحی جیسے نابغہ روزگار موسیقار، جو برصغیر کے علاوہ وسط ایشیائی ممالک میں بھی معروف رہے۔ وہ افغانستان، چین، روس، عرب امارات، جاپان، آذربائیجان، ہانگ کانگ، سنگاپور، ہندوستان ، ایران اور کئی ممالک میں پاکستان موسیقاروں کی وفد میں شامل رہے اور وہاں اپنے فنکاری کے جوہر دکھائے۔

لیکن انتہائی المیے کی بات ہے کہ آج کل کے موسیقار ان کی استادی اور موسیقاری سے ناواقف ہیں۔ اس کی موسیقاری کو وہ درجہ اور مقام نہ دی گئی جس کے وہ حقدار ہیں۔

رباب کے بڑے استاد اور طرز نگار استاد امام دین صلاحی بلوچ 15 فروری 1979 کو اس جہان فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کی جسد خاکی کوئٹہ کے مشہور قبرستان کاسی قبرستان میں دفنایا گیا۔

استاد امام دین صلاحی کو استاد کا اعزاز حکومت پاکستان نے نواز دی تھی وہ رباب کے بہت بڑے استادوں میں شامل تھے۔ افغانستان کے کئی رباب نواز ان کے ہاں آیا کرتے تھے اور ان سے کچھ نہ

کچھ سیکھتے تھے۔ حکومت چین نے ان کو پرائیڈ آف پرفارمنس پیش کیا جو آج تک ان کے گھر میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ حکومت پاکستان نے ان کو صدارتی ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

جب وہ کراچی کے علاقے گزری میں رہائش پزیر تھے تو ان کے گھر میں موسیقی کی دنیا سے تعلق رکھنے والے کئی معتبر نام تشریف لائے۔ پشتو موسیقار لال محمد اقبال، سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے اکثر موسیقاران کے ہاں تشریف لایا کرتے تھے۔

وہ تین سازوں سرود، مینڈولین اور رباب کے اعلیٰ پائے کے استاد تھے۔ اب اس دور میں یہ تینوں ساز مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ ان سازوں کی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے ان موسیقاروں کی دلجوئی کرنی چاہیے۔

☆

اعجاز احمد بلوچ

زمیں کی یہ آغوش چوموں تو کیسے
یہ انجان منطق بتاؤں تو کیسے

یہ شہرِ محبت ہے بولان اپنا
میں اپنی عقیدت چھپاؤں تو کیسے

وہ دیوار زنداں سے واقف نہیں ہے
میں غم کا یہ قصہ سناؤں تو کیسے

مجھے اس قدر عشق جاناں وطن سے
کہ اس تشنگی کو مٹاؤں تو کیسے۔

میں اعجاز تکمیل آشوب سُر کی
حیاتِ غلامی نبھاؤں تو کیسے۔

لفظ چیدغ

دانیال طریر

جینا اگر اتنا آسان ہوتا
تو میں عمر بھر جیتا
اور اتنی نظمیں لکھتا
کہ دنیا لفظوں سے بھر جاتی
لوگ لفظوں کی آکسیجن میں سانس لیتے
بارود کی بُو میں نہیں
سب لفظوں کی اُڑتی ہوئی تتلیاں پکڑتے
لفظوں کی کشتیوں میں سفر کرتے
اور اُن ساحلوں پر اُترتے
جہاں کے مچھیرے
لفظوں کی مچھلیاں بناتے اور پانیوں میں بہا دیتے ہیں
کوئی بکھرے ہوئے اعضا نہ چُنتا
کہیں مسخ شدہ لاش نہ ملتی
کسی گھر سے جنازہ نہ اُٹھتا
گلی گلی ماتم نہ ہوتے

قبرستان ہوتے مگر قبروں میں صرف وہ لفظ دفنائے جاتے
جنہیں متروک قرار دے دیا جاتا
کتبوں پر نظمیں لکھی جاتیں
جن میں مردہ لفظوں کے دوسرے جنم کی خوش خبریاں ہوتیں
دُنیا میں مزدوری صرف خوبصورت لفظ تلاشنے کے لیے کی جاتی
جس کی اُجرت لفظ ہوتے
لفظ کھو جاتے تو لوگ روتے
اور اُن کی آنکھوں سے زار و قطار لفظ بہتے
لفظ نئی ترتیب میں ڈھلتے تو لوگ قہقہے لگاتے
اور لفظ گونجتے ہوئے خلاؤں کی خامشی تک چلے جاتے

کمیونسٹ جرائد کا تاریخی سفر

شاہ محمد مری

اس کے علاوہ اس شمارے میں وہاڑی کسان کانفرنس کی رپورٹ شامل ہے۔ اور اس کے بعد تو حسبِ معمول اُن نام نہاد سوشلسٹوں پہ لفظوں کی چابک بازیاں ہیں جو پیپلز پارٹی کو انقلابی اور مارکسسٹ پارٹی قرار دینے کا مکروہ کام کر رہے تھے۔

عنوان: ''موقع پرست سیاست''۔

ایک نظریاتی مضمون ''سوشلزم اور جنگ'' کے موضوع پر ہے جو دراصل لینن کی تحریر کا ترجمہ ہے۔

25 نومبر 1972 میں ''درست فیصلہ'' کے عنوان کا اداریہ چھپا ہوا ہے۔ جس میں پاکستان کی طرف سے تین سوشلسٹ ملکوں کو تسلیم کرنے کے اقدام کو سراہا گیا۔ یہ ممالک شمالی کوریا، شمالی ویت نام اور مشرقی جرمنی تھے۔ ساتھ ہی دوسرا اداراتی نوٹ ہے جس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

رسالہ ایک بار پھر پیپلز پارٹی کو سوشلسٹ بنا کر پیش کرنے والے موقع پرست دانشوروں کی گردن ناپتا ہے۔۔۔ عنوان ہی سے اس اداراتی نوٹ کا ٹون معلوم ہو جاتا ہے: ''بورژوا مفادات کی ترجمان پیپلز پارٹی۔۔۔''

'' جھلکیاں'' نامی مضمون کے ابتدائی فقرے یوں ہیں: ''پیپلز پارٹی کی پروپیگنڈہ مشینری کو انتخابی مہم کے دوران چلانے میں نام نہاد سوشلسٹوں نے حصہ لیا اور اُس کی حکومت کے سائے میں اپنے اور اس پارٹی کے مخالف سوشلسٹوں کے خلاف رسوا کن مہمیں چلائیں۔۔۔ اور پھر ہر دو چھوٹے صوبوں بالخصوص سرحد میں پیپلز پارٹی کے اس عزم کو سہارا دینے اور ہموار کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ وہ اقلیت میں ہونے کے باوجود سندھ پنجاب کی طرح سرحد و بلوچستان میں بھی حکمرانی کرے''۔ اندازہ کیجیے کہ پیپلز پارٹی کے یہ نوبھرتی شدہ دانشور کس قدر موقع پرست لوگ تھے۔ انقلاب تو کیا انہیں تو عام جمہوری رویوں تک کی تمیز بھی نہ تھی۔ اکثریتی حکومتوں کو توڑوا کر اقلیتی حکومتوں کو مسلط کرنا ۔ یہ تھا ان کا انقلاب !!۔ اخبار عوامی جمہوریت اور پارٹی دونوں نے پیپلز پارٹی میں پناہ گزیں اِن سوشلسٹوں کے مزدور دشمن پروپیگنڈہ کو کبھی نظر انداز نہ کیا۔ ایک مستقل نظریاتی صفائی ستھرائی کا وظیفہ تھا جسے وہ جاری رکھے ہوئے تھے۔

بلاشبہ یہ اہم سماجی فریضہ تھا۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے تو پیپلز پارٹی کے بلند آہنگ بھگوڑے لفٹسٹ، مزدور تحریک اور اُس کی نمائندہ سیاسی پارٹی، پاکستان سوشلسٹ پارٹی میں انتشار پھیلانے میں کامیاب ہو جاتے۔ اور جو تحریک پہلے ہی کمزور تھی مزید نحیف ہو جاتی۔ اِس پروپیگنڈہ مہم کے دفاع میں سوشلسٹ پارٹی کی نظریاتی دستاویزات جو عوامی جمہوریت اور پمفلٹوں کی صورت میں شائع ہوتی رہتی تھیں، ایک زبردست قسم کا ڈھال تھیں۔

2 دسمبر 1972 کا شمارہ بھٹو کی خارجہ پالیسی پہ تنقید پر مبنی ہے۔ اس میں سی آر اسلم کی طرف سے نومبر کے آخر میں کی جانے والی پریس کانفرنس بھی دی گئی ہے جو کہ پاکستان کے آئین کی بہت سی باتوں پہ اتفاق سے متعلق ہے۔ سی آر اسلم نے بالخصوص آئین کو پارلیمانی اور وفاقی بنانے پر اطمینان کا اظہار کیا۔ البتہ اس میں مزدوروں کے حقوق اور صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔

16 دسمبر کا اداریہ ''سوشلسٹ انقلاب کا مینارِ نور'' والا عنوان رکھتا ہے۔ یہ دراصل ویت نام کو پاکستان کی طرف سے تسلیم کیے جانے پہ منعقدہ اُس جشن کا احوال ہے جو پاکستان سوشلسٹ پارٹی کی طرف سے لاہور میں منعقد کیا گیا۔ مگر کھچا کھچ بھرے ہال میں تقریروں نعروں کی طرح رسالے کے ایڈیٹوریل میں بھی یہ احتیاط رکھی گئی کہ اس سے پیپلز پارٹی سامراج دشمن یا سوشلسٹ پارٹی قرار نہ پائے۔ وہ اس حکومت کو بورژوا حکومت قرار دے کر اس فیصلے کو پاکستان کے عوام کے دیرینہ مطالبہ کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

عوامی جمہوریت کا 23 دسمبر کا شمارہ بورژوا دانشوروں کی اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ ''معاشی ترقی کا راستہ ملی جلی معیشت میں ہے''۔ دلچسپ ہے کہ آج نصف صدی گزرنے کے بعد بھی بہت سارے گوسفند پوست بھیڑیے دانشور سوشلزم اور کپٹلزم کا مکسچر پلانے کی سیمناری تقریریں کرتے پھرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پچاس سال قبل ان کی مخالفت کی جاتی تھی مگر آج انہیں انقلابی اکانومسٹ قرار دے کر تالیوں سے نوازا جاتا ہے۔

رسالہ کے نزدیک معاشی ترقی کے لیے تین شرائط کا پورا کرنا ضروری ہے۔

1۔ 50 ایکڑ زرعی اراضی کی حد ملکیت رکھ کر اوپر کی ساری اراضی بلا معاوضہ لے کر مزارعوں، کھیت مزدوروں اور کسانوں میں تقسیم کی جائے۔

2۔ غیر ملکی سرمائے پر انحصار ترک کیا جائے۔

3۔ اجارہ دار صنعتوں، بنکوں، بیرونی تجارت اور غلے کی تجارت کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔

رسالہ اپنے بقیہ صفحوں میں روزمرہ کی معاشی نظریاتی بحثوں کو چھیڑتا ہے جن کا مقصد ایک سوشلسٹ معیشت کی تفہیم اور اُس کے قیام کی

ضرورت واضح کرنا تھا۔

30 دسمبر کے شمارے میں ایک عجب سرخی لگادی گئی: ''پیپلز پارٹی کا سامراج نواز سوشلزم''۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس طنز بھرے عنوان کے نیچے متن کس قدر زہر میں بجھی چاقو بازی کرتا ہوگا۔ جن لوگوں کو بھٹو کی منتقمانہ فاشسٹ مزاج کا معلوم ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ رسالہ خودکشی کی حد تک اُس کی مخالفت کر رہا تھا۔ بھٹو کی مخالفت اور وہ بھی باریک بینی سے!!۔

اداریہ پاکستان کا آئین مرتب کرنے والی کمیٹی کو اپنی سفارشات دیتا ہے۔ ''ایسا آئین جس میں محنت کش عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ دیا گیا ہو، طبقاتی نمائندگی کا اصول موجود ہو، صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کو نجی املاک کو بلا معاوضہ قومی ملکیت قرار دینے کا حق حاصل ہو''۔

1973

6 جنوری 1973 کا ٹائٹل مضمون ''آمدِ سالِ نو 1973'' ہے۔ یہ پانچ صفحوں پہ مشتمل اس شمارے کا طویل ترین مضمون ہے۔ اس مضمون کی ابتدا اِن خوبصورت الفاظ پر مشتمل ہے: ''۔۔1972 کا سال اپنی پشت پر واقعات، حادثات اور تبدیلیوں کا بوجھ لادے خود تو ختم ہوگیا لیکن اپنے بوجھ اور اس کے نتائج کو آنے والے 1973 کے سپرد کر گیا''۔

اس مضمون میں پچھلے سال کے واقعات کا تذکرہ موجود ہے، بین الاقوامی بھی اور پاکستان میں بھی۔

اس شمارے میں 31 دسمبر 1972 میں منعقد ہونے والی پارٹی کی مرکزی کمیٹی میٹنگ کی قراردادیں موجود ہیں۔

13 جنوری کا شمارہ پاکستان کے ''مجوزہ آئین'' جو کہ قومی اسمبلی میں پیش کر دی گئی تھی، پر اپنا موقف دیتا ہے۔ اس مضمون میں کسی ملک کے لیے آئین کی اہمیت اور افادیت پہ بحث کی گئی۔ پاکستان میں طبقاتی سماج کے وجود اور گہرائی و گیرائی کا تذکرہ کیا گیا۔ چنانچہ پہلے تو اس بنیاد پر اسے مسترد کیا گیا کہ بالائی طبقات کے تیار کردہ اِس آئین میں محکوم طبقات کے لیے اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ گو کہ اس میں فیڈریشن کی بات کی گئی ہے مگر اس میں قبائلی علاقوں اور ریاستوں کا وجود رہنے دیا گیا ہے۔ اس آئین میں ایک مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے کر دوسرے مذاہب اور ان سے وابستہ لاکھوں ہم وطنوں کے ساتھ امتیاز برتا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار بنیادی انسانی حقوق کے برخلاف باتیں اس میں ڈال دی گئی ہیں۔ نظریاتی کونسل کو غیر ضروری قائم کر کے قومی اسمبلی کی خودمختاری پہ وار کیا گیا۔ آئین میں زمین، کارخانوں اور بنکوں کی نجی ملکیت کا تحفظ کیا گیا ہے۔

20 جنوری کے عوامی جمہوریت کا اداریہ ہے: ''جمہوریت کا تماشہ نہ بنایئے!''۔ اس میں ایک کمال بات کی گئی۔۔۔''مسٹر بھٹو کی محض جمہوری اور پارلیمانی بنیاد پر مخالفت مسٹر بھٹو کے بعد ایک نئے صدر ایوب کو جنم دے گی جو پھر ایک نئے یحیٰ خان کو ملک کا آمر بنا کر رخصت ہوگا اور پھر ایک نیا راہنما۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ ایک نہ ختم ہونے والا چکر چلتا رہے گا۔ مگر جمہوریت بحال نہ ہوگی۔۔خواہ اقتدار پی پی پی کے ہاتھ میں آئے یا جماعت اسلامی کے ہاتھوں یا نوابزادہ نصراللہ کو مل جائے نتائج یکساں برآمد ہوں گے کیونکہ ان تمام کی طبقاتی ضروریات بھی یکساں ہیں۔۔۔۔

اس شمارے میں ایک مضمون ''دوست دشمن'' کے نام سے موجود ہے:

''اس سلسلے میں ہم بلوچستان کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ سامراجی اقتدار کے نوآبادیاتی دور میں بلوچستان کو انتہائی پسماندہ علاقہ کہا گیا اور آج بھی کہا جارہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے عوام کو بلوچستان کے صحیح حدود اربعہ تک کا علم نہیں۔ ان کے تصور میں بلوچستان ایک لق و دق صحرا ہے۔ یہاں بلوچ گڈریے بھیڑوں کی کھالیں اتارتے رہتے ہیں۔ اس تصور کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم آزادی کے 25 سال گزار چکے ہیں مگر بلوچستان میں نہ کالج ہیں نہ سکول۔ اور وہاں کی یونیورسٹی وعدوں کے سراب کا شکار ہے۔ نئی تعلیمی اصلاحات میں اس کا ذکر ضرور ہے کہ بلوچستان کی یونیورسٹی میں ایک ملحقہ کالج بھی قائم کیا جائے گا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ بلوچستان 25 سال گزر جانے کے باوجود اپنی صحت کے ذرائع سے محروم ہے۔ ڈاکٹر بھی دوسرے صوبوں سے لائے جاتے ہیں۔ صدرِ مملکت نے خدمتِ عوام کا نعرہ لگایا تھا ہم نے اس کی مثال اوپر بیان کی۔ بات کلچروں کے پھلنے پھولنے کی کی جاتی ہے جبکہ عمل اس طرح ہوتا ہے۔

''پاکستان کی بیشتر معدنیات بلوچستان کے پہاڑوں میں دبی ہوئی ہیں۔ اس کو لمبے ساحل سے سالانہ کروڑوں روپے کی مچھلیوں سمندری کیکڑوں وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں جس کا تین فی صد بلوچستان کے عوام کو ملتا ہے اور 97 فیصد مرکز کے خزانے میں پہنچتا ہے۔ عمدہ بندرگاہیں مفقود ہیں۔ اس قدرتی وسائل سے مالا مال علاقے کی زبوں حالی ایک سوالیہ بنی ہوئی ہے۔

''فشریز اور میرین بیالوجی کا انسٹی ٹیوٹ بلوچستان کی بجائے دوسرے علاقوں میں ہے۔ قدرتی گیس بلوچستان سے حاصل ہوتی ہے۔ کان کنی اور جیالوجی اور معدنیات کی سائنس پنجاب اور سندھ کے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے۔ پیٹرو کیمیکل کا ادارہ بھی دوسرے علاقے میں ہے۔ یعنی اس مخصوص علاقے کی پیداوار پر دوسرے صوبوں کے سرمایہ داروں اور افسر شاہی کا قبضہ ہے۔ بلوچستان کی بنیادی تعلیم سے بے پرواہی کا یہ افسوسناک نقشہ ہے۔ جیسا ہم شروع میں کہہ چکے ہیں ہر علاقے کے پیداواری طریقے مختلف ہوتے ہیں اور اگر اس حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو علاقائی ترقی رک جاتی ہے۔ ہمارے

نزدیک بلوچستان کی مخصوص پیداوار پر وہاں کے عوام کا پورا حق ہونا چاہیے۔اس علاقے کی پیداوار بڑھانے کے تمام مسائل کا اختیار براہِ راست وہاں کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے۔تعلیم کے تمام شعبوں کا قیام ان کی مخصوص پیداوار کے لحاظ سے عمل میں آنا چاہیے۔دوسرے الفاظ میں بنیادی تعلیم سے لے کر سائنس، فنی تعلیم تک پورے اختیارات علاقائی ہاتھوں میں ہونے چاہئیں کیونکہ مرکزی خیراتوں سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ بلوچستان قدرتی معدنی وسائل سے مالا مال ہے۔اس کی پیداوار سے ہی علاقے کو ترقی دی جاسکتی ہے اور پسماندگی کو دور کیا جاسکتا ہے ورنہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔۔۔۔''

27 جنوری 1973 کا عوامی جمہوریت تو سمجھیے خارجہ امور پہ وقف تھا۔ پہلا اہم مضمون تو عظیم انقلابی رہنما، ہو چی من پہ ہے۔ اس کی بایوگرافی دی ہوئی ہے۔یہ کہ کس طرح وہ نیشنلسٹ بنا، سوشلزم سے آشنا ہوا اور اپنے وطن کی آزادی اور انقلابی جدوجہد میں کس طرح بین الاقوامیت میں گُھل گیا۔

ایک مضمون ہنگری کے انقلابی شاعر پتوفی پر ہے۔اچھا، خوبصورت اور مفید مضمون۔

3 فروری کا لیڈنگ آرٹیکل بھی ویت نام پر ہے جو کہ 23 فروری کو امریکہ اور ریپبلک آف ویت نام کے مابین جنوبی ویت نام میں قیام امن کے لیے سمجھوتہ ہونے پر لکھا گیا۔ بہت مسرور اور پرامید مضمون۔

3 مارچ 1973 کے شمارے جلی سرخی کے ساتھ اعلان ہے کہ ''پاکستان کی خارجہ پالیسی سامراج نواز ہے''۔وہ دن اور آج کا دن نصف صدی گزر گئی ہے۔ یہ ملک ابھی تک سامراج نواز ہی ہے۔

شمارے میں ملک میں پارٹی کی سرگرمیوں پہ مفصل رپورٹیں شامل ہیں۔نیز ایک نظریاتی مضمون ''مارکسزم اور ریاست'' کے نام سے موجود ہے۔

17 مارچ کا شمارہ سرائے عالمگیر میں کسان کانفرنس کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ایک مضمون سامراجی قرضوں پر ہے جو اخبار کے مطابق پاکستان کی تباہی کا باعث ہیں۔نظریاتی مضمون سوشلسٹ ریاست'' کی اگلی قسط بھی شمارے میں شامل ہے۔

24 مارچ 1973 کے شمارے کا اعلان ہے کہ ''سامراج سالمیت کا محافظ نہیں ہوسکتا''۔ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مرکزی کمیٹی کے اجلاس کی کارروائی اور قراردادیں ہیں سوشلسٹ ریاست کے بارے میں نظریاتی مضمون ہے۔

31 مارچ کے شمارے میں 23 مارچ کو لیاقت باغ راولپنڈی میں متحدہ محاذ کے جلسے پر بھٹو کی یلغار کی سخت مخالفت کی گئی۔ جہاں نیپ کے 9 افراد کی جانیں گئیں۔مضمون میں پیپلز پارٹی اور اس کے نقارچیوں کی طرف سے اس بات کی بھی مذمت کی گئی کہ پاکستان میں پنجابی، سندھی، اور پختون قومیتوں کا نام لینا جرم ہے۔اخبار نے پیپلز پارٹی کا یہ ڈھنڈورا بھی نہیں مانا کہ پاکستان صرف ایک قوم ہے۔

7 اپریل 1973 کے شمارے کا طویل ترین مضمون تو کارل مارکس کی زندگی اور تعلیمات پر ہے۔ یہ رسالے کے تقریباً تین بڑے صفحوں پر مشتمل مضمون ہے۔ اس کے علاوہ 23 مارچ کو پشاور میں منعقد ہونے والے سوشلسٹ کنونشن کی رپورٹ ہے۔جس میں عبدالوحید ایڈووکیٹ کی طرف سے وہاں کی سیاسی اور تنظیمی رپورٹ پڑھی گئی۔اسی رپورٹ میں ذکر ہے کہ صوبہ سرحد میں عبدالرزاق خان کو پارٹی صدر اور عبدالوحید ایڈووکیٹ کو صوبائی جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا ہے۔

14 اپریل کے شمارے میں ایک بار پھر راولپنڈی میں نیپ کے ورکروں کے قتل عام کے خلاف اداریہ لکھا گیا۔

21 اپریل کا اخبار لینن کے یوم پیدائش (22 اپریل) کی مناسبت سے اس کی زندگی اور تعلیمات پر ایک طویل مضمون لیے ہوئے ہے۔ایک نسبتاً مختصر مضمون آرٹسٹ پکاسو پر ہے۔

بھٹو کی زرعی اصلاحات کا مذاق اڑایا گیا۔''پیپلز پارٹی کی زرعی اصلاحات نے ثابت کردیا ہے کہ وہ سرمایہ داروں جاگیرداروں وڈیروں کے مفادات کی نگران اور ترجمان جماعت ہے۔وہ مزارعوں ہاریوں مزدوروں اور محنت کشوں کے مسائل حل کرنا نہیں چاہتی''۔

28 اپریل کے شمارے میں ''سرمایہ داروں جاگیرداروں کا آئین'' کہہ کر بھٹو والے آئین کا پوسٹ مارٹم کیا گیا۔'' صوبائی خود اختیاری کا تقاضا کرنے والوں بھی اس طرح کی صوبائی خود اختیاری مل گئی ہے کہ مضبوط مرکز کی گرفت میں فرق نہ آیا۔۔۔۔ بلوچستان ہو کہ سرحد یا سندھ، مرکز اسی طرح کسی صوبے سے استصواب کیے بغیر معدنی خزائن کے علاقے جس کو چاہے بخش سکتا ہے۔

5 مئی کے شمارے میں مین مضمون تو یوم مئی پر ہے۔اس میں شکاگو کے مزدوروں کے قربانی کے پس منظر کو بیان کیا گیا اور اس پس منظر میں پاکستان کی مزدور تحریک کے لیے اسباق کی بات کی گئی۔دو صفحات کی طوالت کا ایک مضمون اینگلز کا ہے۔''انسان کی تعمیر میں اس کی محنت کا حصہ''۔ اسی طرح 15 اپریل کو لاہور میں منعقدہ پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کی سالانہ لیبر کانفرنس کی رپورٹ تفصیل کے ساتھ دی گئی۔میکسم گورکی کا مضمون :''لینن سچ کی طرح سادہ'' بھی اسی شمارے میں شائع ہوا۔

12 مئی کا شمارہ مست و رقصاں کا مریڈ لال خان کی ساتویں برسی پہ ہے۔اس کی درخشاں جدوجہد کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور مزدور تحریک کے لیے اس کی قربانیوں کو احترام دیا گیا۔

''شاہ ایران اور پاکستان'' کے عنوان سے مضمون میں بلوچستان کے بارے میں شاہ ایران کے عزائم کی مذمت کی گئی۔ یہ شاہ ایران نے اپنی حفاظت کے نام پر بلوچستان پر جھپٹا مارنے کا اعلان کیا تھا۔ مضمون میں بلوچستان پہ بھٹو اور ایران کے یکساں موقف پر تشویش کا اظہار کیا گیا۔

اس شمارے میں ملک بھر میں یوم مئی کے جلسوں جلوسوں کی تفصیل بھی شائع کی۔

دو جون امریکہ اایران اور پاکستان کو تیل کی سیاست سے جوڑ کر دکھایا گیا ہے۔ اسی تناظر میں ایران بلوچستان کو اچھی نظریہ سے نہیں دیکھتا۔ وہ بلوچستان میں جمہوریت کو ایران کے لیے خطرہ تصور کرتا ہے۔

2 جون کے شمارے میں اس نظریاتی اخبار نے اپنی اہمیت یوں واضح کی:

''عوامی جمہوریت کے قارئین کے نام

ہر انقلابی تحریک کو صحیح سائنسی بنیادوں پر استوار کرنے میں نظریاتی تعلیم اہم رول ادا کرتی ہے۔نظریاتی تعلیم انقلابی تحریک کو منظم کرتی ہے۔اور اس کی تنظیم سے ہر قسم کے انتشار جو کہ فکری اور نظری انتشار کی وجہ سے رونما ہوتا ہے اس کو ختم کرتی ہے۔ اس لیے سیاسی کارکنوں کی جو سماج کے ارتقا کو تیز کرنے میں مصروف ہیں کے لیے نظریاتی تربیت بے حد ضروری ہے اور کارکنوں کی نظریاتی تربیت میں پارٹی اخبار بہت ضروری اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' پارٹی کا اخبار ہے جو ہمیں نظریاتی شعور کے ہتھیار سے لیس کر کے انقلاب کا پرعزم سپاہی بناتا ہے،''عوامی جمہوریت'' میں فکری اور نظری اعتبار سے بہت اہم مواد شائع ہوتا ہے جس کا شعور حاصل کرنا سیاسی کارکنوں کے لیے بے حد ضروری ہے۔

''عوامی جمہوریت'' میں نظریاتی شعور کی اہم ترین شکلوں کو ظاہر کیا جاتا ہے۔

1۔عوامی جمہوریت بین الاقوامی اور ملکی سیاسی اور معاشی صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے۔

2۔ سامراجی سرمایہ کی پیدا کردہ تکلیفوں اور نقصانات اور سامراجیوں کی فریب کاریوں کا بھانڈا پھوڑتا ہے۔

3۔عوام دشمن حکمران بازیگروں کی شعبدہ و بازیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

4۔ ہر سیاسی پارٹی کسی طبقے کے مفادات کی محافظ ہوتی ہے۔''عوامی جمہوریت'' سرمایہ داری نظام کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی کوشش میں مصروف سیاسی پارٹیوں کے منشور کا تجزیہ اور ان کے درمیان نورا کشتی کے فریب کو سامنے لاتا ہے۔

5۔ پیداواری قوتوں کو ملکیتی رشتوں کی زنجیر سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے والوں کو مارکسزم لینن ازم اور پاکستان کے مخصوص حالات میں اس کی شکل کے شعور سے لیس کرتا ہے۔

6۔انقلاب کی تاریخ شاہد ہے کہ انقلابی تحریکوں کو سست کرنے کے لیے ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے لیے عوام دشمن حکمران مقدور بھر کوشش کرتے ہیں ۔وہ انقلابی تحریک کی صفوں میں اپنے زرخرید ایجنٹوں کو داخل کرتا ہے جو انقلابی تحریک کے لیے مشکلات کا باعث بنتی ہے:''عوامی جمہوریت''ایسی سیاست کا تجزیہ کرتا ہے جو کہ انقلابی تحریک کو غلط راہ پر گامزن کرنے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔

7۔ ''عوامی جمہوریت'' حکمرانوں کے مزدوروں اور کسانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم وستم کو بے نقاب کرتا ہے۔

16 جون 1973 کے شمارے میں ''مرکزی بجٹ پر ایک نظر'' نامی مضمون کا پہلا پیراگراف یوں ہے۔

''پاکستان میں جون کا مہینہ بجٹوں کا مہینہ ہے۔ ہر سال جب یہ مہینہ آتا ہے مرکزی اور صوبائی بجٹ بنتے ہیں اور ان پر بحث ہوتی ہے۔حکومتی پارٹی کے ممبران اور ان کے دانشور ہر بجٹ کو عوامی بجٹ، محنت کشوں کا بجٹ اور ترقی پسند بجٹ کہہ کر واہ واہ کے ڈونگرے برساتے ہیں اور مخالف سیاسی پارٹیاں اس میں کیڑے نکالتی ہیں اور چند روز کی گرما گرمی کے بعد بجٹ منظور ہو جاتے ہیں اور گرما گرمی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے''۔

شمارے میں ملک کے مختلف حصوں سے پارٹی کی سیاسی سرگرمیوں کی رپورٹیں بھی شامل ہیں۔

23 جون کے شمارے کے اولین مضمون کا عنوان ہے'' پاکستان کدھر جا رہا ہے''۔ اسی مضمون میں بلوچستان کی صوبائی حکومت توڑنے کی خبر بھی ہے اور اسے سنگو کے حالیہ اجلاس کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

اس شمارے میں عوامی جمہوریت نے اپنی اہمیت اس طرح واضح کی۔''دنیا کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ سماجی تبدیلیاں اور انقلابات اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئے جب تک نظریاتی تبلیغ نے انسانی ذہنوں کو ان تبدیلیوں کے لیے آمادہ اور انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار نہیں کر لیا۔ ذہنی انقلاب ہی فی الحقیقت ہر انقلابی تبدیلی اور سماجی ترقی کا ذریعہ بنا ہے اور نظریاتی جدوجہد میں سب سے موثر ہتھیار نظریاتی اخبار ہوتا ہے۔ بغیر نظریاتی اخبار کے کوئی نظریاتی جدوجہد اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتی''۔

اس شمارے میں'' بلوچستان کی حکومت کے خلاف تحریک عدم اعتماد'' نامی ایڈیٹوریل نوٹ لکھا گیا۔جس میں کہا گیا کہ''ہمارا اب بھی یہ مطالبہ ہے کہ بلوچستان میں صوبائی اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے اور نیپ جمعیت کی حکومت بحال کی جائے کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں''۔نوٹ میں گورنر بگٹی کو گورنری سے سبکدوش کرنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔

ایک اداریہ

چھاتی پتھر کی ہے اُن کی جو وفا کرتے ہیں

شاہ محمد مری

ایک اچھے معاشرے کے قیام کی جدوجہد میں دنیا میں جو محنت وخدمات ہیں، سنگت کا حصہ اُن کے مقابلے میں آخر سے بھی آخر میں ہے۔ اسی حقیقت کی بناء پر ہم نے ہمیشہ نمود ونمائش سے گریز کیا ہے اور اِن پندرہ برسوں میں ہم نے کبھی اپنی اشاعت کی کوئی سالگرہ نہیں منائی۔ کیوں کہ سینہ پھُلانے کی کوئی تُک ہی نہیں بنتی تھی۔ اپنے آپ سے بھی اور اپنے قارئین سے بھی یہ غلط فہمی دور کرنا بہت ضروری ہے کہ ہم اِن پندرہ برسوں میں (ماہنامہ نوکیں دور کے دس برس الگ ہیں) فخر وافتخار نہ جتلا کر محض عاجزی نہیں کررہے تھے۔ بلکہ حقیقت ہی یہی تھی کہ عالمی پیمانے پہ یہ اتنا کم ہے کہ اکڑ خانی بنتی ہی نہ تھی۔

ہاں، جن ناموزوں حالات میں ہم اسے جاری رکھتے چلے آئے ہیں اُن کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لیے کہ خصوصی حالات نے اس خطے کو ایک خصوصی حیثیت دے رکھی ہے اور اِن مخصوص حالات کے اندر کوئی سیاسی سماجی اور دانشورانہ کام، عام کام نہیں ہوتا۔

ایک۔ ہماری یہ شمع ایک ایسے بحرانی دور میں جلتی رہی جب خود صبح کا سرخ ستارہ سو برس تک اپنے مقررہ مدار میں رہنے کے بعد اپنے آپ سے روٹھ کر ٹوٹ چکا تھا۔ اس لیے کہ سرد خلا کے گھپ اندھیرے کسی بھی طرح کی تجلی کو اپنی توہین سمجھتے رہے تھے۔ اس اندھیر میں بھی سنگت کا کارواں نہ صرف تاریکی کے مقابل جراتِ کفر کا کارواں بنا رہا بلکہ عوام الناس کے لئے امید وخودداری کا کورس بھی گاتا رہا۔

دو۔ ہم قطبی پڑوس میں زریں مستقبل کے بگل بجانے والے افغانستان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور اب ہمارا واسطہ نظریات کے مالک پڑوسی کے بجائے سامراجیت، اور نسلی وفرقہ وارانہ والے پڑوس کے ساتھ ہوا۔ یہ دیوہیکل جاں گسل موجیں نفس ونفیس کے لیے تو عزرائیل تھیں۔ پورا خطہ خودکُشوں اور خودکُشیوں، ڈرونوں اور ڈراؤنوں، بی بی سی اور وی اوائے، اور، حمید گلوں اور ہیلری کلنٹنوں کے لئے کھلا میدان بن گیا۔ ایسے میں نظریات کی بات کرنا، فلسفہ کی طرف دیکھنا، بحث کی آزادی مانگنا، اور حال کے سیاہ پردوں سے پرے اچھا مستقبل دیکھنا بہر حال قابلِ ذکر باتیں تو ہیں۔

تین۔ خود ہمارے گھر بلوچستان کو، اُس کے اپنے بیٹوں بیٹیوں کے لیے ایک ''گلوٹین گھر'' بنا دیا گیا۔ اس کی جھولی میں بہت سے سر ڈال دیئے گئے۔ زندہ لاشیں مردہ لاشوں میں اور پھر مردہ لاشیں مسخ شدہ لاشوں میں حلول ہونے لگیں۔ پرویز مشرف تو محض ایک علامت تھا وگرنہ پالیسی تو تسلسل ہی کے سبب پالیسی کہلاتی ہے۔ چنانچہ شہر، شہری سیاست اور اس سے وابستہ اجتماع، پریس اور تنظیم کاری کے سارے شعبے بلا جواز بنا دیے گئے۔..... سنگت والوں کا جنون جاری رہا۔

چار: اِن پندرہ سالوں میں جہاں ایک طرف دولتمند وترقی یافتہ میڈیا ہمارے نظریات کو دفن کرنے میں لگا رہا، تو دوسری طرف اِن پندرہ برسوں کی فطری روانی نے ہماری دھرتی کے نیک، فہمیدہ اور تجربہ کار راہنماؤں کی ایک پوری کھیپ قبر کے حوالے کردی۔ اور آج کی ہماری پوری نسل پہاڑ جتنے بڑے عالمی اور مقامی چیلنجوں کے سامنے بغیر راہنماؤں صلاح کاروں کے، اپنا راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہوئی۔ سنگت بھی اسی پندرہ سالہ قید بامشقت کے ذائقے چکھتا رہا۔

پانچ: اِس ملک کی حکومتیں مادری قومی زبانوں کی ترویج وتدریس کے کام کو ہمیشہ سے ناپسندیدہ سمجھتی ہیں۔ بالخصوص زبان وکلچر کی قدر کرنے والے شمالی ممالک میں سوشلزم کی پسپائی کے بعد اس کی صورت مزید ابتر ہوگئی۔ مگر بلوچ اور بلوچی زبان کی خدمت سنگت کا مرکزِ نگاہ رہی ہے۔ ہم سے جو کچھ بن پایا ہم نے شہد وقند ذائقے والی شیریں بلوچی زبان کی ترقی وترویج کے لیے کیا۔

چھ: ماہنامہ سنگت نے اس خطے میں بولی جانے والی دیگر مادری وقومی زبانوں کی خدمت میں بھی حتیٰ المقدور حصہ ڈالا۔

اس مستقل مزاجی سے ہمارے لیے اطمینان کی کچھ ضعیف ونزار کونپلیں ضرور نکلیں۔ مثلاً:

ماہنامہ سنگت کے اِن پندرہ برسوں کی آغوش میں لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی کھیپ وجود میں آئی اور پروان چڑھی۔ نئے نئے شاعر ودانشور تازہ خیالات اور توانا اذہان کے ساتھ ہمارے ہم سفر بنے۔ بے شمار احباب نے کالم نویسی اور افسانہ نگاری اپنائی اور ہزاروں سیاسی سماجی ورکرز کو ہمنوائی ملی۔ ان لکھاریوں میں سے کچھ ''سنگت اکیڈمی آف سائنسز'' نامی ادبی علمی تنظم سے وابستہ ہو چکے ہیں اور ادبی سماجی سائنسز میں تحقیق وتدقیق اور اجتماع وسیمینار کے جاری کاموں میں جتے ہوئے ہیں۔

اسی طرح دنیا بھر میں پھیلے ہوئے بلوچ اور نان بلوچ دانشوروں شاعروں نے سنگت کو اپنا ترجمان بنالیا.....ایک روشن فکر رسالہ جو کثیر السانی ہے۔

رسالہ اِس بات پہ بھی مطمئن ہے کہ اس نے (سیاست میں بھی اور بلوچیت میں بھی) کوئی الگ فرقہ نہیں بنالیا بلکہ یہ عوام وامت کے عمومی کارواں کا (سب سے آخری سہی) اُشتر ہی رہا۔ پورے عوامی کارواں کا پسینہ اور گرد اُسے مزین کرتی رہی، یہ اجتماعی غم وخوشی میں حصے داری کی نعمت سے مامور رہا، اور سماج کے تفویض کردہ شعبے میں اپنا منکسر حصہ ڈالتا رہا۔

سنگت نے بہت ساری مسلّمات کو چیلنج کیا۔ اُن میں سے ایک ''ترقی پسند ادب کی تاریخ'' بھی ہے۔ ہم نے عمومی طور پر ترقی پسند ادب کو 1935 میں ترقی پسند ادبی تحریک سے جوڑ دینے کی ذہنیت کو مسترد کردیا۔ نیز ہم نے اردو ادب میں ترقی پسندی کی تاریخ کو بلوچی زبان میں ترقی پسندی کی تاریخ پہ مسلط ومنطبق کرنے کی مخالفت کی۔ بلوچستان میں تو بالخصوص ہم نے اُسے گیارہ ہزار سال قبل، مہرگڑھ سولائزیشن سے چلے آتا دیکھنا چاہا۔ نیز ہم آج کے ترقی پسند ادب کو معاصر بلوچستان کی عینک سے دیکھنا چاہ رہے ہیں.....آج کا معروض، آج کا سیاق سباق اور آج کا آس پاس..... یوں ہم نے زندگی کے ساتھ جڑے ہوئے آرٹ کو کسی طرح کی مصنوعی ٹانگیں دینے کی معذرت خواہی کو دور پھینک دیا۔

سنگت اکیڈمی ایک اور غلط العام بات سے بھی بھڑ گئی: ہم نے ہمارے منطقے کے نیک، اچھے، معتبر، متبرک اور عوامی انسانوں کو صوفی گیری کی مدہم، غیر واضح اور اوہام بھری اصطلاح میں مقید کرنے کے خلاف تحریک چلائی۔ ہم نے وسطی اور جنوبی ایشیا کے اِن تمام برگزیدہ انسان دوست فلاسفروں کی توصیف جدلیاتی اصولوں کے مطابق کی۔ انہیں ''اُن'' کے زمانے کے سیاسی معاشی اور تہذیبی سیاق وسباق میں دیکھا اور توصیف کی۔ انہیں جامد بت، اور نرینہ اولاد بخشنے کے ذریعے کے بجائے اُن کی تعلیمات کو اُن کی انسان دوستی کی روح کے مطابق ترویج دی۔

سنگت نے زبان میں جعلی ونقلی القابات ترک کردیئے۔ ہم نے ''آیئے گا جایئے گا'' جیسے فیوڈل القابات کے بجائے عام عوامی استعمال کے القابات والے الفاظ کا استعمال رواج دینے کی کوشش کی۔ ہم ہمہ وقت ''آپ، شما'' جیسے جبراً درآمد کردہ الفاظ کی حوصلہ شکنی کرتے آئے ہیں۔

سنگت نے اس پورے عرصے میں بلوچی رسم الخط میں بڑے پیمانے کی تبدیلیوں پر زور دیا۔ ہمزہ کے بلاوجہ استعمال کی حوصلہ شکنی کی۔ اور اُس کی جگہ ''و''، ''آ''، ''ئے''، اور ''ہ'' کے استعمال کی کوششیں کیں۔ اسی طرح اس نے سٹینڈرڈائزیشن کے نام پر بلوچی کے مختلف لہجوں میں موجود بے شمار الفاظ کو قربان کردینے کی مخالفت کی۔ اس لیے کہ یہ سارے الفاظ بلوچی زبان کے بہت بڑے عمومی خزانے کے موتی ہیں۔ ہم نے انہیں گم کردینے کے بجائے استعمال میں لانے کی ہر ممکن تدبیر کی۔

سنگت ادارے نے کتابیں چھاپنے کا بھی کچھ کام کیا۔ ایسی کتابیں جنہیں دربار کے خوف کی وجہ سے مارکٹنگ میسر نہ تھی۔

ملکی وبین الاقوامی قارئین تک بہتر رسائی اور نئے قارئین پیدا کرنے کے لیے نہ صرف ماہنامہ سنگت ویب سائٹ پر ڈالا جاتا رہا ہے بلکہ سنگت ادارے کی کتابوں کی بھی مفت اور آسان فراہمی کے لئے انہیں ویب سائٹ پر میسر کردیا گیا۔

ارے ہاں، اس عرصے میں ''سنگت'' رسالہ کے کچھ بہت ہی تلخ دشمن بھی پیدا ہوئے۔ (بلوچی میں کہتے ہیں کہ جس کا مخالف نہ ہو تو زمین خود اس کی مخالف بن جاتی ہے)۔ فکری دشمنوں کا تو خیر اندازہ اور توقع ہوتی ہی ہے۔ اِن سے کسی طرح کی خیر ورعایت کا سوچنا بھی بے کار ہے۔ اور اُن کا جواب نہ دینا بھی شکست خوردگی ہوتی ہے۔ مگر کچھ ایسے انجانے اور بے خبر بدخواہ بھی پھوٹ پڑے جن کا فکری آگا پیچھا تک معلوم نہیں۔ ادھار کی کوئی نسل پرستی، بھیک مانگی کوئی ادب شناسی، یا محض ''آؤ دیکھو میں بھی ہوں'' کے شعبے کے بدخواہ۔ ان سب کی مشترک شناخت یہ رہی ہے کہ یہ ''بدزبان'' بہت ہیں۔ کوئی پینڈہ نہ ہونے کے باوجود ایسی اتھارٹی سے بات کریں گے جیسے ''مالکِ مکان'' ہوں۔ اتنی پست زبان کہ آدمی منہ تکتا رہ جائے۔ مگر ہم: تری ہر بات پہ چپ رہتے ہیں رہم سا پتھر بھی کوئی کیا ہوگا۔ سنگت حساس بلوچستان میں رہتے ہوئے بھی غوغا گیر رقیبوں کو گالیاں واپس کرنے کے بجائے انہیں سنجیدہ تخلیقی کاموں کی طرف متوجہ کرتا رہا ہے.....اور کچھ جگہ ہم کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

ہم ایسے ہی تھے، ایسے ہی ہیں، اور ایسا ہی رہنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

غزل

کاوش عباسی

ہوئے ختم دھوکے سفر میں خوشی کے
ہمیں راستے چاہئیں واپسی کے
عجب چاہ تھی یہ کہ خواہاں رہے ہم
ہمیشہ کسی اور کی روشنی کے
تھی مانگے کی سب دل کی دُنیا ہماری
یہ چاند اِس کسی کے، وہ خواب اُس کسی کے
کہیں تھے قدم بھر، کہیں عمر بھر ہم
یہ اپنے ہی میزان تھے زندگی کے
بنے، بگڑے، ٹُوٹے، ہوئے اجنبی پھر
تھے سب رِشتے ایسے دلِ اجنبی کے
جو تھے تاب خوں کی، بنے مَرگ کی لَو
جو تھے خواب، خنجر ہیں اَب خودکُشی کے
وہ دریا ہے آگے کہ سانپوں کا جنگل
نہیں کچھ بتاتے شواہد ابھی کے
پڑا آ کے وار اَور اِک میری جاں پر
مَیں بیٹھا ہی تھا کاوش اِک زخم سی کے

لیبر ڈے

سعدیہ، شکیل

خانساماں، مالی، چوکیدار، ڈرائیور، ماسی.....آج صبح سے سب کی پریڈ لگی ہوئی تھی۔۔۔

مجھے کسی قسم کی کوتاہی نہیں چاہیے۔۔۔۔!

شیشے کی طرح ہر چیز، ہر ہر کونہ چمکتا ہوا چاہیے.

ساتھ ہی خانساماں کو گھورتے کہا... سعید!!

۔۔سب سے بہترین چیزیں ہونی چاہیں مینو میں۔۔ سمجھ رہے ہونا۔۔

پھر گرجتے ہوئے چوکیدار سے مخاطب ہوا.

کریم۔۔۔۔خبردار کوئی ایرا غیرا داخل نہ ہو خاص کر یہ جو روز منہ اٹھا کر لوگ نت نئی درخواستیں لے کر آجاتے ہیں۔۔اپنی منحوست پھیلاتے کمی لوگ۔۔

مجھے ہر بندہ الرٹ چاہیے۔ اور اگر کوئی کوتاہی ہوئی تو سب کی پکی چھٹی۔۔۔

انتہائی نخوت سے سب پر گرجنے کے بعد فون ملا کر۔۔۔۔۔۔

زمانے بھر کی شیرنی لہجے میں سموتے ہوئے زیرلب مسکراتے ہوئے۔۔۔۔۔

آئی جی صاحب!! پلیز کچھ نفری تو بھیج دیں سکیورٹی کے لیے۔ وہ دراصل آج یکم مئی ہے۔تو بس چھوٹی سی تقریب رکھی ہے لیبر ڈے کے حوالے سے۔۔۔۔

جی جی اسمبلی کے دوست وغیرہ بھی ہیں۔۔۔آں۔۔ہاں جی میڈیا والے بھی ہونگے. اب یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔۔۔۔۔ارے نہیں زیادہ دیر کی نہیں ہوگی زیادہ ٹائم نہیں لینگے آپ کا ۔۔۔۔۔۔ساتھ ہی زوردار قہقہہ۔۔۔۔۔

اسی دوران پینا فلیکس اٹھائے مزدور اندر آئے سرایک نظر دیکھ لیں پھر ہم اسے دیوار پر لگا دیتے ہیں. وہ غور سے آہستہ آہستہ پینا فلیکس پر لکھا شعر پڑھنے لگا

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں،

ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات۔۔۔۔۔۔

یہ محض اک افسانچہ نہیں. اک مسلمہ حقیقت ہے. جس پر ہم آگے بات کریں گے۔ کیونکہ سرمایہ دار کی مکاریوں عیاریوں کے باوجود ہر سال یکم مئی کو دنیا بھر میں یومِ مزدور منایا جاتا ہے، جو محنت کش طبقے کی خدمات اور جدوجہد کو سراہنے کا دن ہے۔ یہ دن منصفانہ ماحولِ کار کی تاریخی جدوجہد کو یاد کرنے، محنت کشوں کی کامیابیوں کا جشن منانے اور مستقبل میں ترقی کے لیے آواز بلند کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پاکستان میں یومِ مزدور کی خاص اہمیت ہے، کیونکہ یہاں محنت کشوں کے حقوق اور فلاح و بہبود کے لیے ایک طویل اور مسلسل جدوجہد جاری ہے۔

یومِ مزدور کی جڑیں 1886ء میں امریکہ کے شہر شکاگو میں پیش آنے والے میدانِ ہے مارکٹ کے واقعے سے جڑی ہوئی ہیں۔آٹھ گھنٹے کام کے دن کا مطالبہ کرنے والے محنت کش ہڑتال پر چلے گئے تھے۔ بعد ازاں ہونے والے ایک مظاہرے کے دوران پولیس کے ہاتھوں محنت کش جان سے گئے۔ اس واقعے نے بین الاقوامی برادری نے غصے اور محنت کش تحریک سے ہمدردی کا اظہار کیا، جس کے نتیجے میں بالآخر یکم مئی کو یومِ عالمی مزدور کے طور پر منانے کا آغاز ہوا۔

پاکستان کی محنت کش طبقے کی تاریخ اس کے نوآبادیاتی ماضی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ برطانوی راج کے دوران، محنت کشوں کو کم سے کم حقوق اور تحفظات کے ساتھ سخت حالات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔1940 کی دہائی میں آزادی کی تحریک نے محنت کشوں کی بہبود پر دوبارہ توجہ دی۔ تاہم، آزادی کے بعد کے دور میں استحصال جاری رہا جس کے نتیجے میں 1950ء اور 1960 کی دہائی میں مزدور یونینوں کا عروج ہوا۔ان یونینوں نے کم از کم اجرت اور چھٹیوں جیسی بنیادی حقوق کی فراہمی میں اہم کردار ادا کیا۔

1972 کی لیبر پالیسی ایک سنگ میل ثابت ہوئی، جس نے کم از کم اجرت، سماجی تحفظ کے فوائد اور کام کے گھنٹوں کی حدود متعین کیں۔ تاہم، منصفانہ محنت کش پالیسیوں کے حصول کی جدوجہد تاحال جاری ہے۔

اگرچہ پاکستان نے محنت کش حقوق کے حصول میں کوششیں کی ہیں، لیکن اب بھی اہم چیلنجز باقی ہیں:

پاکستان کی ایک بڑی افرادی قوت غیر رسمی شعبے میں کام کرتی ہے، جہاں کم اجرت، ملازمت کی عدم تحفظ اور سماجی فوائد تک محدود رسائی جیسی مشکلات کا سامنا ہے۔ اس شعبے میں سڑکوں کے مزدور، گھریلو ملازم اور تعمیراتی مزدور شامل ہیں، جن میں سے بہت سارے لوگ استحصال کا شکار ہیں۔

بچوں کی مزدوری کے خلاف قانون سازی کے باوجود، یہ رواج خاص طور پر دیہی علاقوں میں موجود ہے۔ بین الاقوامی محنت کے ادارے (آئی ایل او) کے مطابق، پاکستان دنیا بھر میں سب سے زیادہ بچوں کی مزدوری والے ممالک میں سے ایک ہے۔

پاکستانی خواتین کو کام کی جگہ پر کافی

مشکلات کا سامنا ہے۔ انہیں کم اجرت، ترقی کے محدود مواقع اور بچوں کی دیکھ بھال کی سہولیات تک رسائی نہ ہونے جیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

صنعتی حادثات اکثر رونما ہوتے ہیں، جو فیکٹریوں اور ورکشاپوں میں حفاظتی قوانین کی سخت نفاذ کی اشد ضرورت کو اجاگر کرتے رہنا وقت کا تقاضا ہے۔ الغتصر پاکستان جیسے ملکوں میں مسلسل شکا گو ہوتا رہے۔

ریاست کا نج کاری کا سلسلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ مزدور کا استحصال جاری ہے...

مجموعی طور پر سوشلسٹ معاشرہ ہی طبقاتی فرق کو مٹا سکتا ہے۔ یوم مئی منانے کا مطلب ایک سوشلسٹ سماج کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم ہے۔

تنبیہ

سلیم شہزاد

یہ نظامِ عدل کے قوانین ہیں
دونوں پلڑے برابر رہیں
کچھ فرشتے ہیں اور کچھ شیاطین ہیں
سانس لینے کی پاداش میں
دھر لیے جائیں گے
تعجب نہیں
خواب تو ٹوٹے ہیں پہلے بھی
نئے خواب آنکھوں میں اور
بھر دیے جائیں گے
نیند میں کچھ خلل نہ پڑے
یہی منشور ہے
خاموشی تو عبادت کا معیار ہے
یہی دستور ہے
ہونٹ سی لیجیے
گر زباں کھول دی
لا پتہ کر دیے جائیں گے......!

پدگرد

میر ساگر

ڈُ مپرہ گرحدادات زندے منا
من کتابانی،لبزانی سنگت نباں
شاعری آ مُدامی آرخصت کناں

دردو دوراں گوں مئے سنگتی بیت نہ بِی
اڑنزو آہانی سوداگری بیت نہ بِی
گیر کاراں نہ پڑمُردگیں ساعتاں
کندگے جُوڑباں دَردمندیں لباں
باغ و بستان کناں چَپّ وچا ِگردگاں
رَنگ رنگیں نہالاں گوں زندے ِکشاں
باغبانی کناں
من یَہ درچکے بیاں رہگوزی مردماں

ڈُ مپرہ گرحدادات زندے منا
چُو رویے باں شہ ڈُکّھاں ہمک بے سما
چُلّ ئے لمبے ِگراں قصّہے اِشکناں
بندو چاچانی ڈُنیا آ آباد باں
رو چے ملکے گراں
بادشاہی کناں

ڈمپرہ گرحدادات زندے منا
لنگڑیں مردمے آ گوں سنگت بیاں
روچے بے مہری ئے یارزَمبے ِگراں
پِنڈ و ہنڈے کناں

غزل

شاہ زمان بھنگر

ہم نے جو گذاری تھی، زندگی بھی کم کم تھی
سچ کہوں تو دنیا میں دلبری بھی کم کم تھی

ہم نے اپنے لفظوں کی آبرو بچائی تھی
خامشی کا پردہ تھا۔ رہبری بھی کم کم تھی

آنکھ کی سماعت سے ہم کلام تھے ہم تم
پھر شکایتیں کیسی۔ شاعری بھی کم کم تھی

کم سخن جو بولے گا، حرف حرف تولے گا
اس کے سامنے تو پھر نغمگی بھی کم کم تھی

فہم کے نگر میں جب فکر کا بسیرا تھا
ربط و ضبط تھا جیسے، بے خودی بھی کم کم تھی

اس نے منتظر رکھ کے قید کر دیا گویا
شور تھا ہواؤں کا، کپکپی بھی کم کم تھی

ہم کو دان کرتے تھے، بے زبان تاویلیں
مانگتے تھے یکسوئی، جب کبھی بھی کم کم تھی

ہم نے پر کیے رکھا آنکھ کا یہ مشکیزہ
شاہ زماں ترے دل کی سرخوشی بھی کم کم تھی

رسول بخش پلیجو

(21فروری1930۔۔۔7جون2018)

شاہ محمد مری

ہمیں اُس تلخ وشیریں شخص کی صلاحیتوں کی مختلف جہتوں کو الگ کرنے اوران کے زیادہ اور کم ہونے کی لسٹ بنانے میں بہت عرصے تک مشکل کا سامنا رہے گا۔ ''ابھی تک'' کی فانی دنیا میں اٹھاسی برس تک جینے والا یہ آدمی بہت باصلاحیت تھا، بڑا محنتی تھا۔سندھ کا یہ لیڈر انتہائی پڑھا لکھا آدمی تھا۔ وہ ایک مفکراور زیرک سیاستدان تھا۔ وہ ایک خوبصورت افسانہ نگار وشاعر بھی تھا۔ وہ تاریخ دان، آرٹسٹ، پیشہ ور اور انتہائی بہادر انقلابی تھا۔ رسول بخش پلیجو قانون دان، عوامی حقوق کی خاطر بے خوف لڑا کا، شاہ لطیف کو سمجھنے سمجھانے والا، پالیسی ساز، سٹریٹیجیشن، اور پائے کا آرگنائزر تھا۔

حالانکہ مجھے ٹھٹھہ ضلع میں جنگشاہی شہر کے قریب گاؤں منگر خان پلیجو میں علی محمد پلیجو اور لاڈی مائی کے ہاں پیدائش کے تذکرے سے شروع کرنا چاہیے ۔مگر میں اُس کی گیارہ سالہ جیل بھگتنے سے بات شروع کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو کہ ہم کسی خاص آدمی کی بات کررہے ہیں۔(اس سلسلے میں اس کی کوٹ لکھپت جیل کی ڈائری نے سندھی ادبی حلقوں میں بہت مقبولیت حاصل کی)۔ 88 سال اِس دنیا کو دینے والے، لوئر مڈل کلاس سے وابستہ اِس معمر سیاستدان نے 50 سال منظم سیاست میں گزارے۔اوراگر مزید سچ ڈھونڈنا ہوتو اصل میں اُس نے 65 سال سیاست کی۔(1953 میں ہاری تحریک میں شمولیت کے وقت سے)۔

1964 میں وہ شیر بکری، گیدڑ اور لگڑ بھگر کو ایک ہی گھاٹ میں رکھنے والی نیشنل عوامی پارٹی میں تھا۔نکل گیا۔اور پھر ایک کمال یہ بات ہے کہ وہ جی ایم سید کے ساتھ بھی رہا اور وہاں بزمِ صوفیائے سندھ کرتا رہا۔اور پھر جیے سندھ محاذ میں۔ بعد میں سید سے بھی سیاسی راہیں جدا کرلیں۔ سچی راہ کی تلاش میں اُس نے کچھ عرصہ کمیونسٹ پارٹی میں بھی گزارے، وارانہیں کھایا، چھوڑ دیا۔

اس نے 5مارچ 1969 میں سندھی عوامی تحریک کی بنیاد رکھی۔وہ اپنی اس نئی پارٹی کا جنرل سیکریٹری بنا۔گرفتار ہوا، 9ماہ جیل گزاری۔

1973 آئین کے بارے میں لکھا، چھ ماہ جیل۔ 1975 میں ڈی پی آر، گیارہ ماہ جیل۔ 1976 میں 14 ماہ جیل۔1978 میں بھٹو پھانسی کے وقت 3ماہ جیل۔

1986 میں رسول بخش پلیجو کچھ عرصہ عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) میں بھی شامل رہا لیکن پھر اسے چھوڑ دیا۔اسی طرح وہ دوسرے الائنسوں میں بھی جاتا رہا مگر، کہیں بھی زیادہ دیر تک ٹک نہ سکا۔

پلیجو ایک اچھا تنظیم کار رہا۔وہ آخر تک عوامی تحریک نامی پارٹی کا سربراہ تھا۔سندھی شاگرد تحریک اس کی قائم کردہ اور اُس کی پارٹی کا طلبا میں ماس فرنٹ ہے۔اُس کی پارٹی کی خواتین ونگ سندھیانڑیں تحریک بھی کافی منظم ہے۔اسی طرح اس نے کسانوں، اور وکیلوں کو بہترین انداز میں منظم کیا۔ایک زمانے میں تو ایس ایس ٹی اور سندھیانڑیں تحریک سندھ کی مقبول ترین تنظیمیں رہی تھیں۔

اگلے مورچوں کے سپاہی اس پلیجو نے عام محنت کش کسان طبقات کی عورتوں کو گھر کے آنگن سے نکال کر قومی، جمہوری اور عوامی سیاست میں داخل کیا اور نظریاتی وانقلابی عورت کے روپ میں مرد محنت کشوں کے شانہ بشانہ طبقاتی قومی حقوق کی جنگ لڑنے میدان میں لایا۔سندھیانڑیں تحریک کے لیے سفید پوش شہری بیگمات کے بجائے کسان طبقے کی عورتوں کو سیاسی جدوجہد کا ہراول دستہ بنادینا اس کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ وہ دور دراز علاقوں کی ہزاروں دیہاتی محنت کش غریب خواتین کو شیر خوار بچے لے کر سیاسی جلسوں جلوسوں اور لانگ مارچوں میں لانے پہ قادر تھا۔اس کی تنظیم کی عورتیں قید وبند کی صعوبتیں بھی جھیلتی رہیں۔اس کے جلسوں میں دھواں دھار تقریروں کے بیچ فوک نغمے ہوتے، انقلابی ترانے ہوتے، آزادی کی شاعری سنائی جاتی، رقص ہوتا، ٹیبلو ہوتے۔ظاہر ہے کہ جس جس گاؤں گوٹھ میں سندھیانڑیں تحریک کی سرگرمیاں ہوتیں تو وہاں کاروکاری، قرآن سے شادی، بے جوڑ کی شادیاں، زبردستی کے رشتے اور وٹے سٹے جیسی حرکتیں اور مظالم کم ہوتے۔عورتوں کو جائیداد میں حصہ جیسے محروم کرنا قابل فخر نہ رہتا۔

پلیجو نے اپنی کیڈر پارٹی کو ماس شکل دینے کی ہر وقت کوشش کی۔ وہ بہ یک وقت طبقاتی پارٹی تھی اور بہ یک وقت قومی ملکی سیاست میں محسوس کی جانے والی پارٹی بھی۔بالخصوص مسافت میں طویل اور حجم میں بڑے بڑے مارچ نکالنے والوں میں پلیجو کا شمار صفِ اول کے رہنماؤں میں ہوتا ہے ۔کسان لیڈر سندھ کے اندر کسان کانفرنسیں کرواتا رہا۔کالا باغ ڈیم بننے نہ دینے والوں کے قافلے میں رسول بخش صفِ اول کے لوگوں میں شامل رہا۔ضیا مارشل لاء کے دور میں سندھ کے اندر ایم آر ڈی منظم کرنے میں اُس کی پارٹی کا بہت اہم رول رہا ہے۔وہ

اپنے ورکرز کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے میں بھی پیش پیش رہا۔ اِس سارے جلسہ جلوس اور مارچوں کا خوبصورت نتیجہ یہ نکلا کہ عوام فیوڈل ریاست کے رعب اور دبدبے سے باہر نکلے۔ دوسرا یہ کہ شعور، تنظیم اور انقلاب وٹس ایپ گروپوں میں دلیل بازیوں سے نہیں بلکہ جسمانی طور پر عوام تک پہنچنے، اسے گلے لگانے، اسے سننے اور اس کو ساتھ لے کر چلنے کا نام ہے۔ اسے سندھ اور سندھی کا زیر ہر وقت تحریر و تقریر، اور جلسہ و سیمینار میں دیکھا جاتا رہا۔

مگر اس سب کے باوجود اُس کی سندھ کی عوامی تحریک سمیت تمام قوم پرست پارٹیاں الیکشن میں پیپلز پارٹی کے بڑے اور بے کار بیل کو کبھی بھی گرا نہ سکیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ پیری، جاگیرداریت، نعرے بازی اور دھوکہ کو نہ گرا سکیں۔

پلیجو نے کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی زبردست مخالفت کی۔ لانگ مارچ نکالے، گرفتار ہوا۔ اور ایم آر ڈی کی تحریک میں تو اُس نے ضیا مارشل لا کو وہ کِک، وہ پنچ اور وہ پنجے مارے کہ سندھ و ہند شاہد ہے۔

اس کی جدوجہد کا ایک اور دیرپا اور انقلابی ثمر عورتوں کے حقوق پہ مبنی اُس کی قائم کردہ تنظیم (سندھیانڑیں تحریک) تھی۔ یہ تنظیم بلاشبہ اس ملک کی تاریخ میں عورتوں کی سب سے منظّم سیاسی تنظیم رہی۔

وہ انقلابی سیاست کے اندر عوامی کلچر کو فروغ دینے کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ اپنی تحریک میں سلوگن، گانوں اور دیگر کلچرل سرگرمیوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔ وہ نئے نئے نعرے بناتا، نئے نئے فکرے تخلیق کرتا، اور نئی نئی اصطلاحات ایجاد کرتا رہتا اور مخالف کے منہ پہ شڑاپ سے مارتا جاتا۔

اس کا پٹواری باپ اچھا آدمی تھا، اس لیے کہ وہ بیوی کو پیٹتا نہیں تھا۔

اس نے بنیادی تعلیم تو وہیں اپنے گاؤں میں ملا مکتب اور مدرسہ سے حاصل کی۔ البتہ اعلیٰ تعلیم سندھ مدرسہ سے حاصل کی۔ سندھ مسلم لا کالج کراچی سے ڈگری لے کر ہی وہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں وکالت کا اہل بنا۔

رسول بخش پلیجو کو میں چھ شعبوں میں زبردست خدمات کے بطور بڑا انسان سمجھتا ہوں۔

سیاست میں وہ جلسوں جلوسوں اور سڑکی سرکلوں کے راستے پر چلا۔ وہ پوری زندگی اپنے ساتھیوں کو پڑھنے کی ترغیب دیتا رہا۔ وہ تاریخ ادب، معیشت اور فلسفہ کا جاننا لازمی سمجھتا تھا۔ وہ اپنے کارکنوں میں کتب بینی کا کلچر عام کرنا چاہتا تھا۔

رسول بخش پلیجو ایک تخلیقی سیاست دان تھا۔ پلیجو سندھ میں فیوڈلزم کے خلاف بھی سر دھڑ کی بازی لگائے رہا۔ اسی طرح وہ قومی حقِ خودارادیت کا بھی چیمپین رہا۔ اس نے قومی حقوق کی سیاست اور طبقاتی سیاست کو بڑی خوبصورتی سے جوڑے رکھا۔ اُس نے بالخصوص سوشلزم کے اُن داعیوں کے خلاف سخت جدوجہد کی جو پاکستان کے اندر قومی سوال کو پسِ پشت ڈالتے تھے۔ وہ انہیں ''پناہ گیر پنجابی نقلی ترقی پسند'' کہتا تھا۔ دوسری طرف اُس نے اندھی قوم پرستی کو بھی مسترد کیے رکھا۔ اُس نے سندھ کے اندر موجود وڈیرہ شاہی کی حمایت کرنے والے نقلی قوم پرست ایجنٹوں کی جھوٹی قوم پرستی یعنی وڈیرہ پرستی کی سندھ دشمن اور عوام دشمن سوچ کو ننگا کیا۔

اُس نے اس باریک نکتے کا بہت واضح تجزیہ کیا۔ اُس کی نظر میں ''سندھی قوم کے ساتھ دوہرا ظلم ہو رہا ہے۔ ایک طرف اپنے گھر کے دشمن یعنی زمیندار، وڈیرے، میر، پیر اور ملّا اُن کی ہڈیاں چبا رہے ہیں تو دوسری طرف بیرونی لٹیرے گروہ اُن کی بچی کھچی پونجی بھی چٹ کرتے رہتے ہیں''۔ اس جگہ پر اُس نے دو مختلف سیاسی دھاروں کو دیکھا۔ ایک طرف کسان عوام تھے جو وڈیرہ شاہی کو اصلی دشمن سمجھ کر اس کے خلاف جدوجہد کو بنیادی اہمیت دیتے تھے، جبکہ دوسری طرف شہروں کے پڑھے لکھے سفید پوش لوگ تھے جو پنجابی پناہ گیر بالادستوں کے خلاف جدوجہد ہی کو اہمیت دیتے تے۔ اب یہ دو متوازی سیاسی دھارے تھے۔ اس لیے دونوں دھارے ناکام رہے۔ رسول بخش نے اس کا ایک تخلیقی حل نکالا۔ اس نے وڈیروں اور پنجابی دونوں کو یکساں درجے کے دشمن قرار دیا۔

اس نے ان وڈیرہ پرست نیشنلسٹوں کو مسترد کیا جن کا کہنا تھا کہ وڈیرہ جیسے بھی ہیں، اپنے ہیں۔ یا یہ کہ وڈیروں کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے اس لیے اس کے خلاف نہیں لڑنا چاہیے بلکہ اس کو اتحادی بنا کر پہلے بیرونی دشمنوں سے قوم کو بچایا جائے، سرداروں وڈیروں کو بعد میں دیکھیں گے۔ اس نے بتایا کہ اگر غدار اور پنجاب کے دلال دقیانوسی، رجعت پرست اور عوام دشمن سرداری وڈیرہ گیری نظام حاوی نہ ہوتا اور نتیجے میں عوام بھوک بیماری اور جہالت لیے سندھ کے کسان عوام وڈیروں کو spare (یا مضبوط) کر کے کسی بھی جدوجہد کو اپنی جدوجہد سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ اس داخلی تضاد کو سمجھے بغیر اور اسے اٹھائے بغیر بیرونی پنجابی قوت سے بھڑ جانے میں کسان عوام ساتھ نہیں دیتے۔ اس کا مشاہدہ تھا کہ قومی جدوجہد کے ذریعے جو کچھ حاصل ہوتا ہے، اس کا مکھن سردار وڈیرہ کھا جاتا ہے''۔ اس نے اپنے کارکنوں کو کہا کہ سندھی عوام کے اِن مطالبات کو قومی جدوجہد کے پروگرام کا لازمی حصہ بنائیں۔ اس کی نظر میں قومی جدوجہد کی کامیابی کا بنیادی دارومدار اسی مسئلے پہ ہے۔ اگر اس مسئلے کو نظر انداز کیا گیا یا صرف چال بازی سے عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی تو پھر بے شک لاکھوں بار ''جیے سندھ'' کے نعرے لگائیں نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا''۔

اسی طرح پلیجو انقلاب کے گدی نشینوں'' کی بھی سخت مذمت کرتا ہے جو بڑی پنجابی قوم کے لوٹ مار کو سیدھا سیدھا یا پھر لفاظی اور ہیرا پھیری سے چھپا دیتے ہیں۔ اور مجرد طبقاتی سیاست کی بات کرتے ہیں۔ پلیجو اس بات کو نہیں مانتا کہ سندھ کو پنجاب کا صرف سرمایہ دار لوٹتا ہے۔ اور وہاں کے غریب طبقے کا اس میں کوئی مفاد موجود نہیں۔ لہذا قومی سوال فضول ہے اور انقلاب کی خاطر اس مسئلہ کو ملتوی رکھا جائے (1)۔

اُس کا خوبصورت فقرہ: قومی اور طبقاتی جدوجہد ایک دوسرے کی ساتھی ہیں نہ کہ مخالف۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سامراج ،مارشل لاؤں، فیوڈل لارڈز ، رجعت پسندوں اور شاونسٹوں سے بہ یک وقت حالت جنگ میں رہتا۔ اتنی ہی شدت کا مناقشہ وہ نعرے باز ترقی پسندوں سے بھی رکھتا تھا۔ اور ان چھ قوتوں کے خلاف اس کی بے شمار کتابیں اور کتابچے موجود ہیں۔ اس نے تو اپنی ڈھلتی عمر میں خود اپنے بیٹے تک سے سیاسی اختلاف کیا اور اُس سے الگ پارٹی بنالی۔

رسول بخش پلیجو ایم کیو ایم کو فاشسٹ تنظیم اور پیپلز پارٹی کو سندھ کی سوداگر پارٹی قرار دیتا رہا۔

اُس کی سیاست میں اگر کچھ خامیاں رہ گئیں تو اُس کی وجہ بنیادی طور پر یہ تھی کہ اُس کی سیاست کے علاقے کا نچلا طبقہ مزدور نہیں، کسان طبقہ رہا۔ اور کسان طبقہ اپنے راہنما کو بہت حد تک اپنی نفسیات بخشتا ہے۔

چونکہ کسان اُس کی سیاست اور اُس کے عہد کا نچلا طبقہ تھا ،اس لیے قدرتی طور پر اس کی سیاست پہ ماؤزے تنگ کی چھاپ نمایاں ہونی تھی۔ اس لیے ہم اس کی تحریروں تقریروں، ٹیکٹیکس اور سٹرٹیجی میں اُس فلیور کا تناسب زیادہ دیکھتے ہیں۔

رسول بخش پلیجو اپنے معاشرے کا بھی تلخ ترین ناقد رہا: ''سندھ ساری نگل لی جائے گی تب بھی انصاف کے کان پر جوں تک نہ رینگے گی، مگر بکری کی چوری کے کیس میں کسی قانونی نقطے پر رویژن سپریم کورٹ تک جاسکتی ہے'' (2)۔

رسول بخش سامراج اور مارشل لا کا بھی بہت بڑا دشمن رہا۔

اُس نے ایک تیسری چیز بھی اپنی سیاست کی بنیاد میں رکھی۔ وہ عورتوں کے حقوق کا بہت بڑا چیمپین بن کر ابھرا۔ اس نے کمال حکمت سے کام لے کر عورت کو خانہ داری سے باہر سیاست میں نکالا۔ اور پاکستان میں سندھیانی تحریک کے نام سے عورتوں کی سب سے منظم اور وسیع سیاسی تنظیم بنا کر دکھایا۔

پلیجو صاحب ایک بسیار نویس لکھاری رہا۔ اس کی تحریر چبھتی ہوئی ،شوخ ، تیز اور عالمانہ تھی۔ فقرہ دیکھیے: جس طرح کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کسی دیو کی سانس کسی طوطے وغیرہ میں ہوتی تھی ،اسی طرح سماج کی سانس اُس کے معاش کے ذریعوں میں ہوتی ہے۔ اس نے بے شمار کتابیں کتابچے اور پمفلٹ لکھے۔ اس نے ایک ضروری اور بنیادی کام یہ کیا کہ اپنی سیاسی پارٹی کے لیے ''تحریک'' نامی رسالہ نکالا۔ یہ انقلابی رسالہ سیاست، معیشت ، ثقافت اور ادب میں رہنما کا کردار ادا کرتا رہا۔ زبان اور موضوعات دونوں اس قدر عام اور عوامی تھے جو کسانوں کو سمجھ میں آتے تھے۔ اُس کے اس رسالے پہ پابندی لگی اور اس کا ڈکلیریشن منسوخ کیا گیا۔

اس نے ہی سب سے پہلے بہت بلند آواز سے محمد بن قاسم کو سندھ کا قاتل لکھا تھا۔ یہ گویا اسٹیبلشمنٹ کے نظریے سے کفر تھا۔ وہ زندگی بھر اسی طرح کے کفر سرکاری نظریات کو مارتا رہا۔

اس نے قدامت پرستوں کی طرف سے شاہ لطیف کے اوپر چڑھائی گئی تارک الدنیا والی نام نہاد صوفیانہ ملمع سازی کو اکھاڑ پھینکا اور اس کے کلام کے اندر موجود انقلابی جوہر کو تلاش کرلیا۔ اس نے شاہ کے کلام میں حوصلہ دینے والے ، جدوجہد کرنے والے ، مایوسیوں کو بھگانے والے، اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے ، نہ جھکنے والے اور تافتح جہد کرنے والے بڑے حصے کو نمایاں کیا۔

اور لہٰذا اپنی کتابوں پر پابندیاں لگواتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس نے سیاسی ،فکری تنقیدی ادب اور تاریخی موضوعات پر 35 سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ اس نے لٹریری کرٹسزم پہ ایک کتاب لکھی تھی: ''اندھا اوندھا وتیج'' (اندھے الٹے طبیب)۔ یہ کتاب روایتی سندھی ادب پر اُس کی بہت بے رحمانہ تنقید پر مشتمل ہے۔ ادبی دنیا میں ہلچل مچادینے والی اس کتاب کو پاکستان کی ہر قوم میں متعارف کرادینا چاہیے تاکہ ہر زبان کے عوام اپنے ادب میں عوام دوست اور عوام مخالف ادب کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچنے کے قابل ہوسکیں۔ اس نے سوا سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ''اپنے ہمسفر اور ساتھی ادیب اور دانشور محترم رشید بھٹی کے نام'' ڈیڈی کیٹ کیا تھا۔

ادب میں فکری تنقید کی روایات کو مستحکم کرنے میں پلیجو کا نمایاں کردار رہا۔ مقدمہ لڑنے کا انداز دیکھیں ذرا! ''اگر حافظ، خیام، فردوسی، رومی، امیر خسرو، شاہ، سچل اور دوسرے اپنے دور میں بغاوت نہ کرتے تو زندہ ہی دفن ہوجاتے اور کسی کو پتہ تک نہیں چلتا کہ ان ناموں والے لوگ بھی دنیا میں تھے۔ بُلھا شاہ، فرید ، عطار اور سنائی جیسے شاعر ''انا الحق'' کا نعرہ نہیں لگاتے۔ اگر اقبال یزدان کے دامن چاک کرنے کی دھمکی نہ دیتا تو اس کے فن میں عظیم خلوص، سچائی، وجدان، حسن اور کمال پیدا نہ ہوتا اور وہ اس طرح دفن ہوجاتے کہ سننے میں بھی نہ آتے کہ وہ تھے بھی یا نہیں۔۔؟

سچ تو یہ ہے کہ شیخ ایاز اور اس دور کے

نوجوان سندھی ادیب، ان اساتذہ کی بیبا کی، شوخی، گستاخی کے مقابلے میں بالکل دبکے ہوئے اور سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ درحقیقت ہمارے جونقادچی ان نرم آوازوں کوسن کرحواس باختہ ہوگئے ہیں ان کو چاہیے کہ وہ سرکار سے درخواست کریں کہ وہ ان سبھی مندرجہ بالا متذکرہ اردو، فارسی اور عربی شاعروں کی سبھی کتابوں کو آگ لگوادے اور ان کی شاعری پڑھنے پر پابندی عائد کردے، کیونکہ جب تک فن اور فکر کے ان اماموں کا کلام زندہ ہے تب تک ہر دور اور زمانہ میں جرات، رندی، مستی اور بے باکی کی صدائیں فضا میں گونجتی رہیں گی، ہر دور اور زمانے میں ''ایاز'' پیدا ہوتے رہیں گے، جو اِن لُوس لُوس کرنے والے نقادچیوں کی نیندیں حرام کرتے رہیں گے اوران کی کمزوردلوں کولرزاتے رہیں گے''۔

اُس نے ماؤزے تنگ اور ہوچی مِنہ کی سوانح عمریاں لکھیں۔

پلیجو صاحب نے شاعر بھی تھا، جب وہ شاعری کرتا تھا ''تمہارے بعد'' کتاب میں ایسی نظمیں شامل کرتا:

نہیں، تیرے اور میرے جوتوں کو بھی،
ایسے صاف اور چمکدار بنانے کے لیے
ایسی پالش بازار سے نہیں ملے گی،
یہ پالش،
جس نے، ان لانگ بوٹوں پر لگی،
اتنی صدیوں کی غلاظت،
اتنے نسلوں اور قوموں کے،
خون کے دھبے دھوکر،
ان کو اتنا صاف اور چمکیلا کیا ہے کہ،
وہ دنیا کے کسی کارخانے میں نہیں بن سکتی،
یہ ایک گہرا ہنر ہے،
راتوں رات یا دن دِہاڑے،
ان کو چاٹ کر،
ایسا صاف اور چمکتا رکھتی ہیں،
تیرے اور میرے جیسے لوگوں کی زبانیں،
یہ وہ کاریگر زبانیں ہیں،
جو کل،
تیرے اور میرے ساتھ،
جلسوں اور جلوسوں میں، تھانوں اور بندوارڈوں میں،
قوم اور دھرتی،
جمہوریت اور سوشلزم کے،
فلک شگاف نعرے لگا کر۔
اقتدار کے ایوانوں کو لرزاتی تھیں،
اور کل پھر بھی وہی نعرے لگا کر،
خود میں وہی تاثیر پیدا کر کے پرسوں پھر آ کر
راتوں رات یا دن دہاڑے،
ان کو چاٹ کر ایسا صاف اور چمکدار رکھنے کی،
کاریگری میں مگن ہوجائیں گی''(3)

اُس کی کچھ تصانیف یہ ہیں: صبح ہوگی، نابین الٹے چارہ گر، ہنسوں کا قبیلہ، آپ کے بعد، چرواہوں کی چوٹیں، دیکھ کے لال گل، جو کچھ بنگال کے ساتھ ہوا، ہرن مغرور کھڑے سوچ رہے ہیں، اور سندھ پانی کیس۔

اس نے سیاست کو علم سے جوڑ دیا، ادب سے جوڑ دیا۔ بھلا وہ کیسی عوامی سیاست ہوگی جس میں عوامی کلچر اور عوامی ادب موجود نہ ہوگا۔ یا جس میں علم موجود نہیں ہوگا۔ یہ تینوں چاروں چیزیں ایک اچھے معاشرے کی شناخت ہوتی ہیں۔ انقلاب تو بذاتِ خود شاعری، موسیقی، رقص اور فن ہے۔

اس کی زندگی سراپا شاعری تھی۔ وہ جب شاہ لطیف کی شاعری پڑھتا تو ایسا لگتا کہ تین سو برسوں سے بھٹ شاہ پر اسی طرح کا راگ گانے والے فقیروں کے بغیر تنبورے کی تاریں خود بخود چلنے لگی ہیں۔ وہ جب فیض کو پڑھتا تو فیض نے بھی اپنی شاعری اس شدومد سے شاید ہی پڑھی ہوگی۔

وہ ایک اچھا ادبی کرٹیک، ایک کہانی نگار، اور زبردست مقرر تھا۔ اسے کتابوں کے حوالے تفصیل سے یاد تھے۔ وہ فارسی، عربی، اردو اور سندھی اشعار زبانی بولتا تھا۔ اس نے ایاز کی شاعری کے دفاع میں ایک مکمل کتاب لکھی ''نیم حکیم''۔

وہ سندھی، اردو، انگلش، فارسی اور پنجابی روانی سے بولتا تھا۔ اس کے علاوہ سرائیکی، بلوچی، عربی، ہندی اور بنگالی پر بھی اسے خاصی دسترس حاصل تھی۔(4)

پلیجو نے شاعری کے فروغ، انقلابی موسیقی کی ترقی کے لیے باشعور اور منظم کام کیا۔ اس نے سندھی زبان کے مشہور و معروف لوک فن کار زرینہ بلوچ سے شادی کی جو اُس کی سیاست میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

زندگی میں تنقیدیں سہنے کی حامل اُس نے کل 5 شادیاں کیں۔ اس کے ہاں سات بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔ اپنے خاندان کی شریفاں پلیجو سے 5 بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ کشمیری خاتون رقیہ سے ایک بیٹی ایک بیٹا، زرینہ بلوچ سے ایک بیٹا۔ زرینہ کے پہلے سے دو بچے تھے: اختر بلوچ اور اسلم پرویز۔ یہ وہی اختر بلوچ ہے جس نے ''قیدیانڑیں جی ڈائری'' نامی مشہور کتاب لکھی تھی۔ ممتاز افسانہ نگار نسیم تھیبو سے 2 بیٹیاں، زاہد شیخ سے کوئی اولاد نہیں۔

سندھ میں ہندو اقلیت بڑی تعداد میں بستی ہے۔ مگر کچھ تو روایتی برداشت والے سماج کی وجہ سے اور جزوی طور پر پلیجو کی حق پرستی کے باعث کوئی ظلم وزیادتی ہوتی تو سماج اس کا نوٹس لیتا۔

اُسے بندوقوں کے پہروں میں بھی رہنا

پڑا۔ ایک سے ایک جدید خودکار اسلحہ۔ اسکے کارکن کہتے کہ اُسے سندھی قوم پرستوں اور ایم کیو ایم سے خطرہ ہے۔

انتھک سیاسی ورکر ہمارا یہ جی دار، عوام دوست اور سمجھ دار سیاسی رہنما طویل عمر گزار کر بہت سارا شعوری ترکہ، اور بہت سارا کام چھوڑ کر بسترِ مرگ پہ اپنی بیٹیوں، بھانجیوں اور پارٹی کی ساتھیوں کے ساتھ مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی کے انقلابی ترانے گاتے گاتے انتقال کر گیا۔

پٹواری علی محمد اور لاڈ بائی کا یہ بیٹا جب مرا تو خواب وخیال والا ہوا اُس کے ساتھ۔ اس کا جنازہ انقلابی خواتین نے کندھوں پہ اٹھایا۔ وہ انقلابی ترانے گا رہی تھیں۔ تیرے نعرے لگا رہی تھیں، تجھے لوریاں سنا رہی تھیں۔

اس کی وفات حق پر کھڑے لوگوں کے لیے بڑا نقصان ہے۔ دنیا کے ایک علاقے کے محکوموں مجبوروں کا ترجمان نہ رہا۔ انقلابی سیاست پر پچھلی صدی کی آخری دھائی میں جو عالمی جھٹکے آئے، پلیجو ثابت قدم ہی رہا۔ اور شاید یہ اس کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ وہ تھکا نہیں، مایوس نہیں ہوا، رکا نہیں۔

حوالہ جات

1۔ پلیجو، رسول بخش۔ وڈیرہ شاہی کے خلاف جدوجہد قومی جدوجہد کا لازمی حصہ ہے۔ رسالہ تحریک، مارچ 1973، در کتاب ''صبح ہوگی'' فکشن ہاؤس ۔2017۔ صفحہ 34 تا 44۔

2۔ دنیا ساری خواب۔ صفحہ 541

3۔ سروہی، نذیر۔ در کتاب رسول بخش پلیجو ۔2019۔ پیکاک پبلشرز سندھ۔ صفحہ 74۔

4۔ نذیر لغاری، تاریخ ساز لوگ فکشن ہاؤس ۔ 2017 صفحہ 261

☆

احمد ندیم قاسمی

میں روشنی کے تسلسل کو ٹوٹنے ہی نہ دوں
میں شمع بن کے بچھوں، آفتاب بن کے جلوں

شمیم گل ہوں تو کوندے کی طرح کیوں لپکوں
میں سہج سہج کی فضا میں حلول کرتا رہوں

مری فنا میں بقا کے ہزار تیور ہیں
میں خون ہو کے دلِ کائنات میں دھڑکوں

چراغِ آخرِ شب ہوں، مگر تمنا ہے
مسافروں کو افق پر دکھائی دوں تو بجھوں

میں آدمی ہوں عجب طرح کا ستارا مزاج
کہ بار بار سرِ اوجِ آسماں ٹوٹوں

مری اکائی کو جب بھی غنیم للکارے
میں برق بن کے گروں، میں بگولا بن کے اٹھوں

مرے وجود کا مفہوم اجتماع میں ہے
خدا کرے کہ میں انسان سے خدا نہ بنوں

وہی جو دن کو سُنی ان سنی کیے جائے
تمام رات میں سرگوشیاں اُسی کی سنوں

ہوا مجھے بھی لگی ہے نئے زمانے کی
کہ میں بھی اپنے گریباں کے چاک خود سی لوں

خدا ملا تو ہوئی جستجو تمام ندیمؔ
سو طے کیا کہ اب اپنی تلاش میں نکلوں

ہم سَمندَر

کاوش عباسی

دیکھیں آغاز کو جو اپنے ہم
ایک لا مُختَتَم سَمندَر تھے
اُس سَمندَر سے پُھوٹ نِکلے ہَم
سانس پہلی اَزَل میں ہَم نے جو لی
اُس میں تھی اِک کَسک رقابت کی
اَندرُونی اُسی طریقے سے
ہَم نے ٹُکڑے کئے سَمندَر کے
اَور اُساری ہر ایک ٹُکڑے پر
گِردا گِرد ایک ذات کی دِیوار
تھی یہ دِیوار ذات کا خودپَن
بنی یہ ذاتی مِلکیّت کا فَن
خود غرَض دُشمنی کا اِک معیار
یہی دِیوار سَب ہوئی اَزبَر
تھی ہر اِک ٹُکڑے کی شناخت مگر
وہ بڑا ، اَن بٹا ، سَمندَر ہی
رہا اِنسان اَپنا جوہر ہی
ورثہ ہر ٹُکڑے کا کوئی گَر تھا
تو یہی اَن بٹا سَمندَر تھا

نَسلیں اِس وَرثے پر ہی پَڑتی تھیں
ذاتیں اِس وَرثے پر ہی لَڑتی تھیں
اَپنی دِیواریں توڑ دیں ہم اگر
جنگ کا سَنگ چھوڑ دیں ہم اگر
وہی لا مُختَتَم سَمندَر ہَیں
ہَم سَمندر تھے ہَم سَمندَر ہَیں

لونہڑانی موسم ءَ ۔۔۔

مہتاب جکھرانی

لونہڑانی موسم ءَ بیشہ چوں بہار بی
چوں ڈغار ءِ آسمان پجّی بی اوار بی

گشنت انسانا راہڑ چی یے ءِ ضرورت بیشہ انسانا ہماں لوٹہ پیلو کنغا پہ چی یے نہ چی یے ٹاہِشہ۔ اے رنگا انسانا ڈیم بستو ہماں آفانی راہ داشتہ کہ انسانا راوئیلاں دیئغ اث۔ روش ءِ گرمی سرا چو کہ اولی انسانا اول ہچ سِیث نہ رستہ تہ انسانا ہمے گرمی حذائی رنجش گشتہ: چو کہ سیوی بارو اگشنت کہ اے باز گرمیں، ایشی ءِ یک سببے تہ شمس تبریز ءِ گوڑ د پاشنغ ءِ کسو ایں، گشت ئی روش ملتانہ جہلا کئیث، ڈغار سیوی ءَ تو سیث۔ ہمے رنگا اے گرمی بارو افارسی ءَ گشنت:

"سبی وڈھا ڈرساختی
دوزخ چرا پرداختی"

یعنی سبی ءِ استی ءَ دوزہ ءِ ہچ ضرورت نہ یث۔

وختے کہ لونہڑانی موسم ءَ ایذا گواث گشنت تہ اے گواث کاہاری ءَ گرم بنت۔ درا ایریں آف بھڑی ءَ گرم بنت۔ ہذیں تہ بالاچ گورگیج وثی شئیرانی لافا اے سرزمین ءِ گرمیں لوارانی بھیرا بیر گرغ ءِ ہکّلاں داث:

"من گوں بذاں ہنچو کناں
دوداءِ جوریں دڑمناں
چو بز گوں کہیرا ناں کناں
گرمیں لوار گوں چلّڑاں
چو میذ گوں ماہیاں کناں
بز گوں کہیری شنگراں
چو باز گوں کفوتاناں کناں"

وختے کہ شہ مرید حانی ءِ ڈکھاں، وطن کلّی رؤث۔

"قولیں کہ کلاں الکہاں
من گوں ہماں مڑداں رواں
لنگ و ملنگیں دیوانغاں"

شہ موارک ءَ راوثی نچّ ءِ جدائی باز گراں گُزیث۔ مستیں تؤکلی گُشیث کہ نچّی غم کلاں شہ گرانیں ڈکھانت:

"غم تئ شوشاں سمو چو کہ بچّانی غماں"

ہذیں شہ موارک پچھی و سیوی ءِ ہر ہماں ہند ءَ مرید ءَ راپولیث کہ آنہی چُھنا مرید اوذا بیشہ بی۔ شہ موارک پولغا شہ مرید دستاں نہ کئیث، ہئیں کہ کسے شہ مرید ءِ حالے داث۔ کسے ءَ را اگر حالے بیث تہ دینت۔ شہ موارک ہر مڑدم ءِ چکاز ہر گیڑت۔

"ناڑی لِوارشوئیں بلوچ
کسّی دلی درمان نیاں"

اے پیلوی الکہہ ءَ زمستان ءَ ساڑتی گیشتر بیث، آہاڑ ءَ کاہاری گرمی رِشیث۔ گرمی ہمختر باز بیث کہ پٹ ءِ سرا نغن پش جِیث۔ آہاڑ ءَ لونہڑانی موسما تہ تیز و تر ندیں لوار کشنت کہ حذائی امان۔ ہمے موسم ءَ سہدار ہڑی بنت۔ بلوچاں گُر ہڑی ئیں سہداراں شہ وثارارگّغ ءَ پہ پُشتی ءِ فلسفہ دِہ استیں کہ ہڑی ایں سہدار ءِ سرا پُشتی ءَ چغل دئے، آنہی ءَ شہ وثارارکّ۔ بلوچانی گشتن ءَ اے ہماں موسم ایں کہ اے موسم ءَ آس ءَ را موکل ایں۔ ہذیں اے موسم ءَ بازیں ہنداں آس مان کاینت۔

بلوچاں گُرا اے رنگیں گواثانی دارغا پہ ڈوئی و دال مندھ ءَ رامنہہ ءَ گوں لڑ کینغ ءَ گواث جکّ اِیث۔ ہمے رنگا گواث کشغا پہ دِہ ہمے رنگیں بھیر واٹکل استنت

حیدر ہش
گواثا کش

اے رنگیں بھیر و ڈا ہمختر کہن انت چو کہ وث انسان کہن ایں۔

غزل

عابد رضا

جھیل میں ایک شکارا دیکھا اور اسے دیکھا
شام کا پہلا تارا دیکھا اور اسے دیکھا

سرخ حویلی کی دیوار پہ انگوروں کی بیل
مرمر کا فوارہ دیکھا اور اسے دیکھا

شام ڈھلے ویرانے میں جب ریل کی سیٹی گونجی
آنکھ میں سبز اشارہ دیکھا اور اسے دیکھا

اک اجڑا سیارہ وہ بھی کالے کوسوں دور
تنہا اک بنجارا دیکھا اور اسے دیکھا

دشت کی دھول بھری آنکھوں میں چمکا نخلستان
سبز زمرد پارہ دیکھا اور اسے دیکھا

ولادیمیر ایلیچ لینن

ولادی میر مایاکوفسکی

آں شہیدءَ سیغی براثا،
آں ہبدہ سالی گہروءَ
قول داثہ
کہ پکّو اَث
ہر قول وسوغند وہورّاں:
"اڈّا،
ما، راست وحق ءَ پہ جنگ کنوناں
شروع کنوں ما ہمنگیں جنگ ءَ
او
سوب ءَ کٹوں،
بلے، تئی دگ ءَ مانہ گرّوں'
مڑ ونیں دو ہمی طریقہ آں گوں
لینن ءَ ہے قول داثہ

***

آں بیثہ تئی ہیر وکُل وختی............
مجسمہ آں تہ گندی............
مورنا میں مُرگ ءَ ڈولا
گڑ دنا باز بڑ زداری:
"مں تراڈسّاں
کہ چے چے ایں!"
اے ہچ بازی گری نہ بیثی'
ساد ہیں جفاکشی اث

بے ڈراما، بے نمائش
کہ لینن ءَ پُچونڈ کشہ، او زڑنہ
وثی زندگانی ءِ کازءَ ڈولا

سنگت کثغ انت مزور زہ کانڑاں،
فیکٹری آں۔
جہد کثئی
کہ اجرت، ودھنت بلّاں
راہ دراہیں گھوثغنت
مڑنت جھداکنت آں
کٹو تیانی بندکنغ ءَ
او جرمانہ آنی خلافا
او ابلیس ایں فورمین ءَ
شرافت ءِ دگ ءَ ہیل دیثاں

بلے سٹر گل
چھٹرو
ہمنگیں شئیاں پہ نئیں ناں ـــ
کہ یک بوناخیں آفی کڈے
صفا او اچا بہ کنت او گڑ دی
گاماں نرم کنتاں وثی آں ــ
او مطمئن بیث،
پہ کستروئیں چیزے ءَ

انا............

منزل تہ سوشل ازمیں
جوریں دژمن، تہ کیپٹل ازم ایں
او ہتھیار
بوہاری نہ ایں مئے
بلکہ
تو پک ایں، تیریں، تفنگ ایں۔

ہے ٹوکاں
دھک مس دھکی
مان ءَ کنت آں
پورہات جثغیں سُست کثغیں
دماغانی لافا۔

اوبانگھا
آں کہ آخر کار پوہ ءَ بنتاں
تہ دو ہمیاں دِہ پوہ کن انتاں
زی کہ آں درجن اے اثنتاں
مرثی صذانی حساب بیثغنتاں
بانگھوا
ہزاراءَ بنتاں
رونت عمل او جہدءَ لافا
گوں ہمت ءَ او بھڑی ءَ
زنڑ کنتاں آں گرندءَ ڈولا
دانکہ
پورہا (ت) کنوخیں کُل جہاں

زڑ یکی، گرندی
او درکفی سدھائی
پہ بغاوتا
نیں بسیں،
ما اولی بھیرءَ نہ اوں لاوَ
نوخ زاثغیں گوئرک ءَ ڈول ءَ
قہروز ہر وغضب مزورے
منڈارے جی او جُڑھی ثاں
گوں لینن ءِ پمفلٹ وکتاباں
گروخ وگرنداں تیغ بی آں

ہے طبقہ ءَ
لینن ءِ روشنائی
کندھی آں دہ تنگشاو
روشن خیال بیثی ءَ
درکپتہ ژہ
ہزاریں سالانی بے وسی آں

او جواباً رُستہ لینن
عوام ءِ طاقتا گووہ کثی ءَ
جہلی کلاسا او ار کثی ءَ
رُستہ لینن
او
رفتہ رفتہ
گوں رنج ءَ پرّیں سنگتی ءَ

آں راست کنتّاں
ورنائیں لینن ءِ قول ءَ
نِیں کس
وث وثی سرءَ نہ
بلکنا پہ مزدور کلاس ءِ آزادی ءَ (11)
مڑا کا آنی یونین ءَ ڈولا
بی، ٹھی۔
لینن ازم ودھشہ
مزں پاندیشہ
ڈونگھا بیشہ۔

لینن ءِ شاگرد و سنگت
کنغئے شنت
معجزہ در معجزہ یاں
انڈر گراونڈئے ہمت ءَ
ختم نہ ویوخیں (12) ولادی میرکا
سڑک ءِ
دنز و گپ ءَ تہا
ہون ءِ ترنپانی
زیشانی
دیشغ انت۔

مرشی
ماکہنیں گلوب ءَ چرّ ینوں ہمنگا
چوکہ مئے دل لوٹی

گڑہ دِہ
کریملن ءِ آرام کرشیاں
بجتا کنا ناں
کڑدے
ہماں روش ءَ گیر آرتہ نہ خن انت
ناغمان
کہ پُراَث ژہ پراتاں
نار ہاٹاں
زنجیر پروشتغیں
مارچ کنوخانی۔

گیر آر
باز سجلیں ماضی ءَ:
چمہ دیما
ٹراماں دروشکیز نامیں گاڈیاں' کار
موٹراں
ارشا کئے ءَ
گٹی نہ ذاشو
زیلہ سلاخ
پروشتغنت نہ؟

ماوثی مڑگاں جنوں ٹُکر کنوں
وثی چک ءَ کفوخیں بھت ءَ چکا:
آنہاں چھڑوا ے کنہ
کہ بوہاری داشو صفا کثیش
او تالاں کثیش
ریخ۔

'' دراژ نہ بیث، ایماندارث'
شمئے خدمت پہ ثی گل زمینا.........''
وثی جلاوطنّی آنی لافا
لینن عاشق بیشہ
موتک ءَ پُریں طاقتوریں
ہمے سوت ءِ

***

راہک
گوئشت اِش
وثی جندءَ رَنداں کنت روژنا
اوسوشلزم ءَ کنت قائم
بےٹوک و بےتوار ءَ

بلے انّا۔
روس دِہ
دود کش آں گوں ڈٹ کنا ناں روث؛
دونھو ءِ سیاہیں ریشاں
وثی شہرانی چیاریں کنڈاں گچھا
کنت۔
ہچ دیوتا، ہچ بُت نے
کہ پر ما آسماناں ژہ گوارینی
دانانی ہسورا۔

پرولتاریہ ءَ سروغاں بنغی ایں
راہکانی
روس ءِ اخلاق اریں،
کپٹل ءِ لاش ءَ چکا
اولینن راہنمائی ءَ کنت
راہکانی، پورہاتی آنی

آں کنت انباریں وعدہ آں،
لفاظی کنوخیں لبرل او S.R.s
آں وث
مزدورانی ونگاں زین کنغ ءَ ''نہ'' نہ خن
انت۔

''سونے سے پہلے کی نظم''

سلیم شہزاد

پھر ملتے ہیں خوابوں میں
کہتا ہے ہر بار !
میں ناں مانوں یار
خوابوں کے اسرار
وحشت دل میں بھر دیتے ہیں
صحرا جیسا کر دیتے ہیں
درد اور غم کے
اِک منظر میں
کوئی ہجرت کر جاتا ہے
پلکوں سے اُس پار ، سات سمندر
پار

جانے کب ''وہ '' لوٹ آئے پھر
سوچتا ہے ساحل بھی، میں بھی
یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی !

بارش کی امید میں یارب
سوکھ گئے تالاب !
یہ بھی کیا دستور ہے مالک
اپنا حصہ راکھ
پوری نیند کے آدھے خواب !

پلکوں پہ کوئی خواب اتار
ملنے کے اسباب اتار
کوئی پُورا خواب اتار ...!!!

عوامی ادبی سنگت کراچی

انجیلا ہمیش

عوامی ادبی سنگت کراچی کے آٹھویں اجلاس کی روداد۔

عوامی ادبی سنگت کراچی کا آٹھواں اجلاس، ہفتہ چار مئی 2024 میں ہوا۔

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل ممبران نے شرکت کی:

ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈاکٹر ارشد رضوی، جناب جاوید صبا، جناب توقیر چغتائی، جناب شاہ زمان بھنگر اجلاس میں دو نئے ممبران صادق مری اور ماخام خٹک نے بھی شرکت کی۔

اجلاس کا ایجنڈا ارشد رضوی کی کہانی، ماخام خٹک کے پشتو سے اردو میں ترجمہ کیے ہوئے ٹپوں اور صادق مری کی نئی غزلوں پر مشتمل تھا۔

سب سے پہلے ماخام خٹک نے ٹپوں کی صنف اور اپنے تراجم کے بارے میں بات کرتے ہوئے ٹپے سنائے۔اس کے بعد صادق مری نے اپنی دو غزلیں سنائیں، جاوید صبا نے اپنی نئی غزل، توقیر چغتائی نے اپنی نظم، شاہ زمان بھنگر نے بھی اپنی تازہ غزل پیش کی۔فاطمہ حسن نے نظم سنائی، آخر میں ارشد رضوی کی کہانی بہت اشتیاق سے سنی گ ء۔ تخلیقات منسلک ہیں۔

اجلاس میں یہ طے پایا کہ اگلا اجلاس ہفتہ یکم جون کو شام ساڑھے چار بجے ہوگا۔۔جس میں انجلاء ہمیش اپنی نظم سنائیں گی، جاوید صبا اور سویڈن سے آئی ہوئی افسانہ نگار حنا خراسانی سے ان کی کہانی سنی جائے گی۔

وینیو کا جلد ہی بتا دیا جائے گا۔

نسیم سید

جب بپھری خلقت کا سونامی
اپنی شان اور
ان بان کا پرچم تھامے
طاقت کے لشکر کو روند کے
آگے بڑھتا جائے
اپنے ہونے کے اعلان سے
ان کے غرور کی بنیادوں کو سیندھ لگائے،
دہلائے،
تب کرسی اور چھڑی کے آخر
ہوش ٹھکانے آتے ہیں
تب جا کے ان کو خلقت کے
دکھ درد
سمجھ میں آتے ہیں
اور تب یہ مورکھ
ہاتھ باندھ کے
ہاں جی، ہاں جی
کرتی گردن
سینے تک نہوڑاتے ہیں
تب بھوک بھوگتی خلقت کے دکھ نعروں پر
یہ جلدی جلدی تائیدیں
دھر جاتے ہیں

طلعت حسین

فاطمہ حسن

طلعت حسین علم، ادب، صداکاری و اداکاری میں اپنی مثال آپ تھے۔۔میری ان سے پہلی ملاقات 1973 میں قمر جمیل صاحب کے گھر پر ہوئی تھی۔اداکاری کے علاوہ، ادب سے بہت سنجیدہ وابستگی اور عالمی ادب کا مطالعہ ان کی اداکاری کے اسلوب میں بھی نظر آتا تھا۔قمر جمیل صاحب کی دو جلدوں پر مشتمل کتاب" جدید ادب کی سرحدیں" کا انتساب انہیں کے نام ہے۔جب تک قمر جمیل صاحب حیات تھے، طلعت حسین باقاعدگی سے ان سے ملنے آتے۔طلعت حسین کی لکھی ہوئی کہانیاں اور نظمیں قمر جمیل صاحب کے رسالے ''دریافت''میں شایع بھی ہوئیں۔

شہرت کے باوجود طلعت حسین کی پُرخلوص سادگی و بے نیازی نے میرے دل میں ان کے لئے ایک بڑے بھائی کے جیسا مقام و احترام پیدا کردیا تھا۔۔میرے مضامین کے مجموعے" کتاب دوستاں " کے اجراء کی تقریب میں وہ شریک ہوے اور قمر جمیل صاحب پر میرا مضمون انھوں نے پڑھ کر سنایا۔۔ایسے وضع دار پُرشفقت آور نابغہ فن کار کی رحلت صدمے کے ساتھ ذاتی احساسِ زیاں کو بھی شدید کرتی ہے، خصوصاً ایسے وقت میں جب طلعت حسین جیسی ہمہ صفات شخصیات عنقا ہوگئی ہیں۔

سنگت ادبی دیوان لیاری

رپورٹ. رمضان بلوچ

سنگت ادبی دیوان لیاری کراچی کی ماہانہ نشست 29 مئی 2024 کی شام کو بلوچ اتحاد آفس چاکیواڑہ میں رمضان بلوچ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

ایجنڈا کے مطابق صاحبِ صدر نے اپنی نئی کتاب "ایک لاپتہ شہر کا سراغ" کا تعارف پیش کیا۔ کتاب کے موضوع پر بات کی اور کتاب کی تحقیق اور اشاعت کے درمیان کن مراحل سے انہیں گزرنا پڑا اس کی تفصیل پیش کی۔

دوسرا ایجنڈا معروف شاعر وحید نور کا ایک لیکچر "ادب اور سیاست" کے موضوع پر تھا۔ وحید نور نے اپنے لیکچر کا آغاز دلچسپ انداز سے کرتے ہوئے ماضی میں کراچی کے ایرانی ہوٹلوں میں لگے ایک مخصوص بورڈ سے کیا جس پر واضح الفاظ میں لکھا ہوتا تھا کہ "یہاں سیاست پر گفتگو کرنا منع ہے"۔ انہوں نے واضح کیا کہ ایک صحتمند معاشرہ میں سیاست اور ادب کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سیشن ہوا جس میں معیاری سوالات ہوئے جن کے جوابات وحید نور نے اطمینان بخش طریقے سے دئے۔

بعد ازیں ایجنڈا نمبر 3 اور 4 کے مطابق سنگتوں کو اپنی تخلیقات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس پر طنز و مزاح سے بھرپور ایک افسانہ رفیق بلوچ نے پیش کیا۔

اس کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا جس میں مختلف شعراء نے اردو اور بلوچی زبانوں میں اپنی نظمیں اور غزلیں سنائیں اور داد وصول کی۔ جن شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا ان میں اصغر علی آزگ۔ وحید نور۔ اسحاق خاموش۔ حنیف ناشاد۔ اصغر لعل۔ عمران جان بوچ۔ زبیر سخی۔ محمود حسنی اور اورنگ زیب بلوچ شامل تھے۔ دیگر سنگت جو اس دیوان میں حاضر تھے ان کے نام یہ ہیں: امین ضامن۔ زاہد بارکزئی۔ کے بی بلوچ۔ شوکت سبزل۔ شوکت کامریڈ۔ ساحر کلاکوٹی اور استاد غلام محمد خان صاحب جنہوں نے ایک غزل گا کر سنائی۔

آخر میں صاحبِ صدر نے دیوان میں ہونے والی کاروائی کو سمیٹا اور اس نشست کو کئی اعتبار سے یادگار قرار دیا۔ اس کے بعد انہوں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس دیوان کو برخاست کرنے کا اعلان کیا۔

کامریڈ، تمہیں لکھے گئے خط کون پڑھے گا

نصیر احمد ناصر

کامریڈ!
کہاں ہو
کس محاذ پر ہو
مر گئے ہو
یا بچے کھچے بے روح جسم کے ساتھ
بقائے زیست کے لیے اجل سے نبرد آزما ہو؟

کامریڈ!
کائنات کے نامعلوم کناروں تک پھیلی ہوئی
محبت کو دل میں سمیٹتے ہوئے
کیوں نہ سوچا
تمہارے ڈھول اور مٹی ہوتے وجود کو
کہیں ایک کتبے کی جگہ بھی نہیں ملے گی

کامریڈ!
تمہارے پاس سیبوں اور مالٹوں کے باغ نہیں تھے
نہ تمہاری دیواروں پر انگوروں کی بیلیں تھیں
تمہارے دوارے
کن دوشیزاؤں نے خالی ٹوکریاں پھلوں سے بھرنے آنا تھا
تمہیں تو بس
سوکھے بیروں اور کانٹوں سے بھری جنگلی جھاڑیوں سے گزرنا تھا
قفل لگے زنگ آلود آہنی گیٹوں
کائی زدہ سنگی سیڑھیوں
جھکی ہوئی قدیم چھتوں پر اُگی گھاس
اور نا ہموار زمینوں پہ کھلے
ڈیزی کے خودرو پھولوں کا دفاع کرنا تھا

کامریڈ!
اب اداس کیوں ہو
ہارے ہوئے سپاہیوں کا مقدر
خالی ہتھیاروں، بوسیدہ وردیوں کے ساتھ چلتے ہوئے
تنہا راستوں کی تھکن ہوتی ہے
محبت فاتح شہر کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہے

کامریڈ!
مجھے یہ نظم لکھتے ہوئے
خود پر نہیں تم پر رونا آرہا ہے
میں نے تو محبت کو
پاس نہ ہوتے ہوئے بھی
دل سے دور نہیں کیا تھا
اور نوشتہ ہوئے بغیر ہزار ہا سندیسے ہوا کو تھما دیئے تھے
میرے لیے ہار اور جیت میں کوئی فرق نہیں تھا
لیکن تم اس میدان میں
لڑے بنا، بے مرگ مارے گئے ہو
تمہیں لکھی گئی چٹھیاں
اور ان پہ چسپاں ڈاک کے خوش نما ٹکٹ
اب کن ہاتھوں کا لمس بنیں گے؟

موت کے بعد کا بدلا ہوا آدمی

شاہ محمد مری

طاہر محمد خان ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان کی بلوچستان شاخ کے بڑوں میں سے تھا۔ کبھی خود عہدے دار بن جاتا ورنہ بادشاہ گر تو تھا ہی۔ کمیشن کی بہت ساری میٹنگیں ہم نے ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے سامنے موجود اس کے گھر میں اٹنڈ کی تھیں۔ چائے ہوتی تھی، کیک بسکٹ ہوتے تھے اور ایک طرح کے متین و سنجیدہ موضوعات پہ باتیں اور قرار دادیں ہوتی تھیں۔ نہ بہت زیادہ بے جان قرار دادیں، اور نہ ہی اس قدر بھاری بھرکم لفاظی بھرے کہ حاکموں کو لاغر تحریک کا گردن دبوچنے پہ اکسائیں۔ شرکاء میں زیادہ تر مڈل اور اپر مڈل کلاس کے لوگ ہوتے تھے، این جی او ٹائپ کے لوگ، وکیل، ڈاکٹر، صحافی ۔۔۔۔اور ایک آدھ کمیونسٹ بھی۔ کچھ جلوس بھی ہم اسی پلیٹ فارم سے نکالا کرتے تھے۔

انسانی حقوق تو کیا ملتے، البتہ اس سب کا یہ فائدہ ہوا کہ سیاسی سرگرمی کا اچھا موقع ملتا۔ ہم جیسے ممالک میں تو حقوق صرف حکمران طبقات کے ہوتے ہیں: سردار، فیوڈل، وردی بے وردی بیوروکریٹ، اور بڑے تاجر (سمگلر) وغیرہ کے۔ مگر، ہم بس لگے پڑے تھے، عام آدمی کے حقوق کی بحالی کے لیے۔

سب دوست ایک ایک کر کے گئے۔ اُن پرانے لوگوں میں سے دو تین افراد ہی زندہ ہیں، ان میں سے بھی کسی کے گوڈے گٹے بیٹھے ہوئے ہیں، کسی کی یادداشت کی بیٹری ایکسپائر ہو چکی ہے، اور کسی کو گھر سے باہر نکلنے کا بہانہ اور وسائل ہی میسر نہیں۔

طاہر محمد خان پرانا سیاسی ورکر بھی تھا۔ ادب سے بھی اس کی دلچسپی تھی اور وہ لکھنا جانتا تھا۔ 1970 کی دہائی کے اوائل کا زمانہ بھٹو کی طرف سے بلوچ دانشوروں کو بہت متاثر کرنے کا زمانہ تھا۔ بلوچستان میں سیاست کے لیے آپشن نہ کل تھے، اور نہ آج ہیں۔ یا حسبِ معمول سردار کی سیاسی چاکری کرو، یا پھر بھٹوئی بن جاؤ اور وہاں سے اسٹیبلشمنٹ کی بچھائی جال میں پھنس جاؤ۔ چنانچہ بہت سارے دوست جو جائز طور پر، جدلیاتی طور پر انٹی سردار بنے تھے۔ اور آپشن کی غیر موجودگی میں بظاہر سردار مخالف بھٹو کے ہاتھ میں اپنی داڑھی دے ڈالی۔ ان افراد کی نہیں، بلکہ حالات و معروض کی ایسی جگ ہنسائی والی غلطی کہ ساکھ بھرے بے شمار سیاسی ورکرز اور لیڈروں کو ''Callaborators کے بدنما داغ اٹھانے پڑے''۔ معروض کی ایسی بڑی غلطی جس سے مہیب اور خوفناک غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ طاہر محمد خان بھی انہی ناموزوں حالات کا شکار تھا۔۔۔۔ کاش متحرک اذہان کے لیے عمل کے دروازے بند نہ ہوں!۔

اس کے مضامین رسائل اور اخبارات میں چھپتے تھے۔ کچھ سمیناروں میں پڑھے جاتے۔ وہ کبھی کبھی ان مضامین کے مجموعے کو کتابی صورت بھی دے دیتا تھا۔

اب اس کے چلے جانے کے کئی سال بعد اس کا ذمہ دار بیٹا حبیب یہ مسودہ دے گیا۔ مجھ سے چھوٹا ہے اس لیے اس کی فرمائش رد نہ کر سکا۔ ''اسے پڑھیے، اس کی غلطیاں نکالیے، کتاب کا نام تجویز کیجیے اور کتاب کا پیش لفظ لکھیے!''۔ بس میرا ذبح کرنا رہ گیا تھا۔ اگر ضرورت پڑتی تو اس نے وہ بھی کر گزرنا تھا۔

حالانکہ میرے پاس اپنا بے شمار کام پڑا ہوا ہے۔ اور جاسوسوں نے وقت کو بتا دیا کہ اس شخص کے بٹوے میں ریزگاری کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس بے بسی بھرے ہاؤ ہو میں دوستوں کے بیٹوں کی فرمائشیں !!۔ آپ کیا بہانہ کر پائیں گے۔ سو، جھپٹا جھپٹی، تیزا تیزی میں بہت سے اہم کاموں کو کچا پکا کرنے کا رسک لے لیا اور مسودہ دیکھنے لگا۔

یہ ادبی خاکوں جیسے مضامین ہیں۔ پہلا مضمون فیض احمد فیض پر ہے۔ لمبا مضمون، کہیں ادبی نمک مرچ اور چٹنی اچار ڈال دی، ورنہ ویسے ہی ٹھیک ہے۔ کچھ فیض، اس کی شاعری اور کچھ اُس زمانے کا حال جس میں وہ فیض سے متاثر ہوا تھا۔ اور وہ زمانہ بقول گورکی طاہر محمد خان کے "my universities" کا زمانہ تھا۔ تب طاہر محمد خان کراچی میں یونیورسٹی سٹوڈنٹ تھا۔ اس نے مضمون میں یہ جدت اور دلچسپی پیدا کی کہ فیض کے اُن اشعار کو موضوع بنایا جو اُس زمانے میں ضرب المثل بن چکے تھے۔

اس کا دوسرا مضمون سبی کے عبدالرحمٰن غور پر ہے۔ اُس کی غربت پر، اس کی کس مہ پرسی پر۔۔۔ اور اس کی شاعری اور صحافت پر۔

اثر جلیلی پر اس کا مضمون میرے سر پر سے اس لیے گزر گیا کہ اُس سے میری واقفیت نہ تھی۔ نہ ہی اس کے متعلق پہلے کہیں پڑھا تھا، نہ خود اسے پڑھ پایا۔ لیکن ایک اور لحاظ سے یہ مضمون بہت اہم ہے۔ اس مضمون میں طاہر محمد خان نے جو اہم بات کی وہ کوئٹہ میں مرثیہ کے بارے میں ہے۔ اس نے بہت

تفصیل سے یہاں مرثیہ کی روایت کے بارے میں، انعقاد کے بارے میں اور اثر جلیلی کے اس میں فعال ہونے کے بارے میں معلومات دی ہیں۔

اسی مضمون سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں میرے جانے پہچانے طاہر محمد خان نہیں بول رہے بلکہ کسی ادبی میگزین کا ایڈیٹر بات کر رہا ہے۔ طاہر محمد خان باقاعدہ ادبی زبان وڈکشن استعمال کرتا رہا۔ اس پہلو پہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا، جانچا نہ تھا۔

یوں، حتمی طور پر ایک ادبی نقاد ہونے کی کیفیت طاہر صاحب پر پھر پوری کتاب میں جاری رہی۔ وہی استعارات، اصطلاحات، اور ادبی ڈکشن !۔

احمد فراز کا ڈائریکٹ عشق اُسے بہت انسپائر کرتا ہے، مارشل لا کے خلاف فراز کی سینہ سپری طاہر محمد خان کو بھاتی ہے۔ گو کہ یہاں جالب کو وہ بھول گیا۔ اور اس کا تذکرہ اس نے ضمناً بھی نہیں کیا مگر جالب کے ہم قبیلہ احمد فراز کی دلبرانہ شاعری پہ وہ واری واری جاتا ہے۔

حیران کن طور پر پروین شاکر کو طاہر محمد خان نے بالکل ہی الگ انداز میں دیکھا۔ اُس مضمون میں فہمیدہ ریاض کا تذکرہ تو اس نے چلتے چلاتے میں کیا مگر پروین شاکر کو ''نوخیز عشق کی بیان گر'' کہہ کر اسے کمال وابستگی، بھرپور شمولیت، اور قریب ترین اپنائیت سے ٹریٹ کیا۔ میں نے اس کے مضمون میں اس پروین شاکر کے اندر موجود پیار کی بے پناہ پیاس اس قدر دیکھی جو کہ بقول طاہر محمد خان سارے وصال کا سیتا ناس کر دے۔

طاہر محمد خان نے پروین شاکر کی شاعری کو بالکل ہی نئے زاویے سے دیکھا۔ اس پہ لکھے مضمون کا عنوان اس نے ''پروین شاکر اور ازدواجی خوف'' رکھا۔ اور پھر وہ بہت تفصیل سے، بالکل جاسوسی انداز میں اُس کے اسی ''ازدواجی خوف'' کی تفتیش میں لگا رہا۔ پوری شاعری پڑھے بغیر ایسا کہاں ہوسکتا ہے؟۔ یوں وہ اس کے شعری معیار کو بھی جانچتا چلا گیا اور سماجی پہلو کو بھی تولتا رہا۔

مگر صاحب !اس کتاب کا دل تو بیگم سرفراز اقبال پہ اس کا لکھا ہوا مضمون ہے۔ اسے پڑھ کر آپ اُس طاہر محمد خان کو بھول جائیں گے جسے آپ جانتے تھے۔ حسن کیا ہے ،حسن کی اثر پذیری کیا ہوتی ہے ،اس کی بچھی جال کی بُنت اور قوتِ گرفت کیا ہے، طاہر محمد خان ایک اور دنیا کا بن جاتا ہے۔ اُس کا تخیل ہمارے اندازوں سے بہت بلند، بہت ثمر بار اور بہت جمالیاتی بن جاتا ہے۔ اور اردو اس قدر مزیدار کہ حیرت ہوتی ہے۔ ہمارا دوست دالبندین سے نکل کر لکھنو میں جا بستا ہے۔ اور میرزا، مرزا کے چکر سے نکل کر مکمل طور پر ادبی لباس پہنتا ہے۔ ایسی باکمال صناعی کہ طاہر محمد خان کی شخصیت پہ دوبارہ غور کرنے پہ مجبور کر دے۔۔۔

یہ مضمون پسندیدگی، وابستگی، عشق، اظہارِ عشق الغرض محبت کے سارے پڑاؤں پہ مشتمل سی مُرغ اور اُس کے ساتھیوں کا سفر نامہ ہے۔ یہاں وہ ایک مجسم محبت کرنے والے اور ادب میں مستغرق نوجوان کا واحد لباس پہنے ہوئے ہے۔ نہ وکیل، نہ ہیومن رائٹس، نہ بڑھتی عمر۔۔۔ کوئی چوغہ نہیں۔ کاش طاہر صاحب ہمیں یہ مضمون بہت پہلے پڑھوا کر، کچھ برس زندہ رہنے کے بعد، عازم سفر ہوتے۔

بابو شورش اس کتاب کا آخری مضمون ہے۔ ایک تو یہ مضمون مختصر سا ہے، اور دوسرا چونکہ شورش بابو پہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس لیے اس میں کوئی اضافی ایسی معلومات نہیں جس کا ذکر کیا جائے۔

المختصر، طاہر محمد خان بطور ادبی شخص اس کتاب میں کھل کر سامنے آیا۔

دستونک

جی آر شاری

تو منی دل ءِ تہا ئے من تئ ھیالان آں
انگتہ بگند چچو اچ وتہ چے دیر ءَ من

پمن ءَ بلوچستان تئ گشان انت ہپت رنگیں
تو کہ مئے نہ بئے بھت ءَ ہچ کس ءَ نہ زیر ءَ من

چنت سال زندان ءَ گاریں مات ءِ لاڈیں بچ
ھو ہما جنوزام ءِ پروشگیں زھیر ءَ من

تئ گماں چہ گیشیں گم ڈیھ اومئے ڈگارانی
صد بر ءِ اے پروشا پد ورنائی ءَ پیر ءَ من

نئے کہ گیش سبزاں من، نئے کہ ھشک ھیراناں
گڑن وتن ءِ تیلانک اِنت گند کہ مرچاں میر ءَ من

منگل پانڈے

آغا گل

میرا پی اے سلام میٹنگ کے دوران نہ تو فون ملاتا اور نہ ہی چٹ بھجواتا۔اس نے بزر دیا تو میں سمجھا کہ کوئی خاص بات رہی ہوگی دوسری جانب سے کوئٹہ کا سپرنٹینڈنٹ جمعہ خان لاشاری تھا۔کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔

''محمد نثار پوسٹ ماسٹر انفنٹری سکول نے خودکشی کر لی ہے''

مجھے بالکل یقین نہ آیا۔اچھا بھلا تھا۔ایک پوسٹ ماسٹر شادی شدہ کامیاب آدمی۔میں نے جمعہ خان کو سمجھایا۔

'' لوگوں کو افواہیں اڑانے کا شوق ہے۔خود جاؤ،تصدیق کر کے مجھے فون کرنا''

جمعہ خان ترنت بولا'' نثار رسی سے لٹکا ہوا ہے اسی کے ہی سامنے کھڑا ہوں''

میں نے فون پٹخا اور باہر کی جانب لپکا۔کچھ افسر بھی ساتھ ہی چل پڑے۔ان دنوں گیریژن میں داخل ہونے کا ٹیکس نہیں ہوا کرتا تھا۔اب تو کوئٹہ وال قطاروں میں لگ کر ذلیل وخوار ہو کر کوئی بارہ کروڑ سالانہ کینٹ پاس کے نام پر بھرتے ہیں۔سیویلین پر ٹیکس لگانے کا اختیار بلوچستان اسمبلی کو ہے۔نہ کہ سٹیشن کمانڈر کو،مگر یہ معرفت کی باتیں ہیں۔

جب نفنٹری اسکول کی نئی عمارت بنی تو ہمارا ڈاک خانہ بھی باہر نکال دیا گیا۔چند ایک دکانیں بینک بنا تو ہمیں بھی فی سبیل اللہ عمارت کا ایک حصّہ عطا ہوا۔اب بات ہو رہی تھی کہ افتتاح کون کرے گا۔میں ڈاک کا جرنل تھا،ادھر فوجی جرنل۔

میں نے ریکارڈ دیکھا تو سب سے سینیئر جی پی او کا مسو خان میل اوورسیئر تھا۔اس نے پوسٹ کو متاع حیات بخشی تھی۔اسے بطور مہمان خصوصی بلایا۔اس کا تعلق بارتھی ٹرائیبل ایریا سے تھا۔اس نے وردی کے اوپر سرائیکی وسیب کی پگڑی پہنی ڈرائیور والی گاڑی دی۔سرکاری گاڑی میں وہ آیا۔ہم نے بڑھ کر استقبال کیا۔اس نے سرخ ربن کاٹا۔تالیاں بجیں اور ڈاک خانہ فعال ہو گیا۔انگریز نے 1839ء میں تو یہاں باقاعدہ ڈاک خانہ کھولنے کی کوشش نہ کی۔مگر 1876ء میں افغانستان کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ کر کے کچلاک تک قابو کر لیا تو اسے برٹش بلوچستان کا نام دیا۔یہ ادائے دلنوازی تھی برٹش گھانا،برٹش کو لمبیا۔

پوسٹل سروس میں کوئٹہ ہیڈ آفس 1883ء میں قائم کیا۔اصل شہر تو شہواڑیوں کا کراڑیں تھا جہاں ولی بابا کا سلسلہ یک پاسی سید روحانیت کی دنیا بسائے ہوئے تھے۔اس کے پہلو میں کوئٹہ چھاؤنی آباد کر کے اپنی کالونی برٹش انڈیا کو تحفہ دیا۔گیریژن چلانے کے لیے بھارت بھر سے مستری، بڑھی، کاروباری، بوہرے، پارسی منگوائے۔کوئٹہ شہر دراصل چھاؤنی کا سٹیلائٹ ہے۔جہاں اس کے ملازمین بستے ہیں۔آقا و بندہ کا احترام دو صدیوں سے اسی کروفر سے قائم ہے۔اب بھی 14 اگست کو درشن جھروکہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بابائے ڈاک خانان 601 ورک شاپ قائم کیا۔اس کے بعد سٹاف کالج پھر قلی کیمپ۔بارو زئی اور کاسی پتھریلی بنجر زمینیں برٹش پر بیچتے رہے۔زرخیز ہموار زمینیں کوئٹہ کی اپنے قبضے میں رکھیں۔جس کے باعث ہمارا سٹاف پیڈل مارتا روز چھاؤنی کے ڈاک خانوں میں آتا جاتا۔قلی کیمپ کا سٹاف تو دھونکنے لگتا یا جلدی فوت ہو جاتا۔

دراصل شمال کے چھ درے بند کرنے کے لیے بولان ریلوے زاہدان ریلوے بنائی تھی۔کیونکہ برطانیہ نے ہندوستان کی کالونی سے اس قدر کمایا کہ چھوٹے سے برطانوی جزیرے کا حاکم Emperor بن گیا۔زار روس اور نپولین کی رال ٹپکتی دیکھ کر برطانیہ گھبرایا تھا۔یہ اس کے جذباتی فیصلے تھے جسے افغانستان نے دل سے لگائے رکھا۔

ہم ڈگ بھرتے ڈاک خانے میں داخل ہوئے پولیس اور ہندوستان کی کالونی بچائے رکھنے والے فوجی پہلے سے ہی موجود تھے۔نثار کا گلا تو پھندے میں تھا،مگر زمین سے لگ کر اس کے گھٹنے مڑے ہوئے لگے تھے۔جسم کا وزن برداشت نہ کرنے کے باعث ٹیڑھے ہو گئے تھے۔میں نے چونکہ چھپ چھپ کر ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھے تھے کیونکہ بابا جاسوسی ناولوں کے خلاف تھے۔ان ناولوں کے باعث میں کچھ عمران اور کرنل فریدی قسم کا بن چکا تھا۔میں نے ان فوجی اور پولیس افسروں سے کہا کہ یہ خودکشی نہیں قتل ہے۔ورنہ پاؤں ایک دو انچ ہی زمین سے بلند تو ہوتے۔میری آہ وفغاں کے باوجود وہ مرد ناداں مصر تھے کہ یہ خودکشی ہے۔میرے ساتھ بھی افسروں کی نفری تھی۔وہ بھی میرے ساتھ ہی خم ٹھونک کر کھڑے ہو گئے۔جس پر باوردی افسر بڑے جز بز ہوئے۔

'' سینکڑوں لوگ جیتے مرتے ہیں آپ نے تو وقار کا مسئلہ ہی بنا لیا ہے۔یہ تو فوت ہو گیا،قتل ہو یا خودکشی دوبارہ واپس تو نہیں آ سکتا۔اس پر تکرار کی کیا ضرورت ہے''

بلڈی سویلین انگشت بدنداں تھے۔مجھے حیرت ہوئی۔

''یہ ہمارا ساتھی ہے۔ہم قاتل کو پکڑ کر سزا تو دے سکتے ہیں،زندہ کرنے کا کب کہتے ہیں''

بوٹ وردیاں متامل تھیں۔

''انفنٹری سکول میں قتل! پورا جی ایچ کیو ہل جائے گا۔اتنی بڑی دھماکہ خیز خبر سے ہمارے افسر زیرِ عتاب آجائیں گے''

میں جھلا گیا '' آپ کو پروموشن کی پڑی ہے۔میرا پوسٹ ماسٹر قتل ہوگیا ہے''

وہ مجھے ایک جانب لے گئے۔اور دوستانہ مشورہ دیا کہ میں زبان بند ہی رکھوں۔وہ چاہتے تھے پریم چند کے افسانہ دوبیل کی طرح ہم ہیرا اور موتی بیل کی طرح پریم سے رہیں۔باہم سینگ نہ اڑائیں۔

پوسٹ ماسٹر بدستور پھندے میں تھا۔جبکہ ہماری بحث تکرار کی صورت اختیار کر گئی۔اس کی تو کسی کو پرواہ نہ تھی۔قربان علی مری کا خیال تھا کہ یہ بحث بے سود ثابت ہوگی۔طاقتور کی درخواست کو حکم سمجھا جائے۔سید محمد خالد اور حاجی معزالرحمان گومگو کی کیفیت میں تھے۔اکاؤنٹینٹ منظور احمد،ایس ایم کوثر کے علاوہ امتیاز علی اور اکرم کا بھی اسرار تھا کہ ہم اپنے موقف پہ ڈٹے رہیں۔کسی نے فوٹو گرافر منگوانے کے لیے بھی آدمی دوڑا دیا تھا۔یہ رائے بھی تھی کہ پریس کو خبر دی جائے۔یہ دیکھ کر آمد و رفت کا دروازہ سپاہیوں نے بند کر دیا۔اور ڈاک افسر 'قید میں ہے بلبل صیاد مسکرائے' کی مجسم تصویر بن کے رہ گئے۔

وردیوں بوٹوں نے باہم کچھ مشورے کیے پھر چند پولیس افسر آئے ''اگر یہ قتل ہے تو ظاہر ہے آپ کے لوگوں نے ہی کیا ہوگا۔ہم ان افسروں کو تھانے لے جاتے ہیں۔پوچھ گچھ کرتے ہیں۔قاتل کا پتہ چلاتے ہیں''

یہ سنتے ہی افسر سبکتگین کی ہرنی کی طرح مجھے دیکھنے لگے۔میری بھی سٹی گم ہوگئی۔قربان علی مری میرا اسکول فیلو بھی تھا۔اس نے مجھے اشارہ کیا ہم دونوں ایک جانب ہٹ آئے۔

''جناح کی زیارت میں قید،فاطمہ جناح کے پیٹ میں زخم،لیاقت علی خان کا قتل اس کا سبھی کو علم تھا کوئی اسمبلی ممبر نہ آیا صرف لیاقت علی خود لاعلم تھا،نواب نوروز خان کا انجام۔بھٹو کی پھانسی۔کیا اتنا کافی نہیں ہے۔ایسا نہ ہو کہ ہمارے کچھ افسروں کو پھانسی اور عمر قید ہو جائے''

یوں تو میں پوسٹ ماسٹر جنرل تھا یہ سن کر جرنیلی تو ہوا ہوئی پوسٹ ماسٹری ہی بچی۔مجھ پر ڈاک خانیت طاری ہوگئی۔

''آپ کیا چاہتے ہیں''

میں نے دوٹوک سوال کیا۔

انہوں نے فائل پہ رکھا ایک کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔

''اس پر دستخط کر دیں کہ یہ خودکشی ہے''

میں نے مڑ کر افسروں کو دیکھا۔ان کے چہرے فق ہو چکے تھے۔میں نے بلا تامل دستخط کر دیئے۔اور ڈاک خانے سے باہر نکل گیا۔مجھے یوں لگا نثار پھندے سے نکل کر جھپٹ پڑے گا۔میرا گریبان پکڑے گا۔حالانکہ یہ پکڑا پکڑی میدان حشر تک موقوف تھی۔

ہم تو گریژن سے رفو چکر ہونا چاہتے تھے۔مگر سٹاف کالج پوسٹ آفس کے کوارٹروں میں وہ فیملی سمیت مقیم تھا۔لازم تھا کہ بیوہ سے اظہار ہمدردی اظہار یک جہتی کے لیے ان کے ہاں جائیں۔انفنٹری سکول اور سٹاف کالج قریب ہی تھے۔ہم ان کے ہاں پہنچے۔برآمدے میں دری بچھی تھی۔بہت سی عورتیں اور عملہ کے کچھ لوگ بیٹھے تھے۔مجھے یقین تھا کہ بیوہ اس سانحہ غیر متوقع قتل پہ پچھاڑیں کھا رہی ہوگی۔لوگ لخلخہ سنگھا رہے ہوں گے۔

پوسٹ ماسٹر جنرل کی آمد کا اعلان کیا گیا۔بیوہ چادری اوڑھے شاہانہ جلال سے بیٹھی تھی۔آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے انتقام کے انگارے تھے۔جوں ہی میں قریب پہنچا اس نے مجھے للکارا'' آ گیا میرے شوہر کا قاتل پوسٹ ماسٹر جنرل جس کے ظلم سے تنگ آ کر میرے شوہر نے خودکشی کر لی۔اور کہاں ہے قربان علی مری؟ میرے شوہر پر سختی کرنے والا''۔

مری نے کچھ بولنا چاہا تو میں نے اشارے سے منع کر دیا کہ جب وہ پہچانتی ہی نہیں وضاحت کی کیا ضرورت ہے۔

کچھ دیر وہ جلی کٹی سناتی رہی پروپیگنڈا تو Fifth generation war fare کا حصّہ ہے۔بوٹوں وردیوں کی لپک جھپک دھمک نے باور کرا دیا تھا کہ نثار نے محکمے کے افسروں کی سختی سے گھبرا کر خودکشی کر لی ہے۔اس وقت جان بچا کر نکلنے میں ہی عافیت تھی۔ہماری ہمدردی کے بول سینوں میں ہی ابل کر رہ گئے۔گیریژن جاتے میں ہم سینہ تانے پروقار افسر تھے مگر واپسی پہ سرکک تھے،Spineless زمین سے سینہ گھسیٹتے۔گردن اٹھانے کی طاقت نہ تھی۔اپنی کرسیِ افسری پہ میں دھم سے آن گرا۔فوراً ہی ایک کڑک چائے لانے کو کہا۔

کچھ ہی دیر میں ایک فائل کور لیے اکرم آیا۔وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر انویسٹیگیشن تھا۔میں نے متجسس نظروں سے دیکھا اور فائل سے چپکی درخواست پر نظر ڈالی۔اس نے قبل از وقت فوری طور پر ریٹائرمنٹ کی درخواست دی تھی۔

''جب میں اپنے مظلوم ساتھی کے قتل کی تحقیق نہیں کر سکتا تو اس عہدے کی کیا ضرورت ہے۔خدا حافظ''

وہ صاحبِ اولاد تھا۔ایک بیٹا چرسی بھی تھا۔چرسیوں کے تو اخراجات بھی کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

''نوکری چھوڑ کر کیا کرو گے؟''

میں نے سوال کیا۔ویسے میرا تو دل چاہتا تھا کہ میں اپنی درخواست بھی لکھ ڈالوں۔مگر پیاز کی ریڑھی لگانے کی طاقت نہ تھی۔تیسری پشت تھی سرکار کی مداحی میں۔

اکرم دکھی تھا،چائے بھی نہ پی اور تھکے ہوئے جواری کی طرح سر نہوڑائے چلا گیا۔جیسے کلر راؤنڈ لنگڑی پٹ گیا ہو۔

ابا کے دور میں اچھا تھا جونیئر کلاس،ون سینیئر کلاس ون برٹش انڈیا کے ابتدائی دور میں Queen's Bounty کے نام پر ہر ماہ مشاہرہ ملا کرتا Pay کا لفظ

تو کہیں بعد میں آیا۔اب ہم کالے انگریز سے Bounty لیتے تھے۔بھلا ہو بھٹو کا خود شیواز ریگل کا ذوق رکھتے تھے۔مگر درخت رز پہ پابندی کے مرتکب ہوئے۔محمود وایاز کو پینٹ میں دوڑانے کا اہتمام کیا۔ستراں گریڈ سے دوڑتے ہانپتے بائیس گریڈ تک پہنچتے پتلون لنگوٹی ہو جاتی رتن ناتھ سرشار کا آزاد گھس گھس کر مرزا ظاہر دار بیگ بن جاتا ہے۔دل میں چند Stent سرگنجا،مرغ کی بانگ سے ہی دھل جائے وہ طوفان والا بن کر افسر ریٹائرڈ ہوتا تو دور سے چغد نارائن دکھائی دیتا کسبیوں کی طرح اس کا چہرہ دور سے ہی پہچانا جاتا۔

ایک دو روز تو اذیت اور ذہنی تکلیف میں گزرے پھر ماحول بدلنے کے لیے دالبندین کے دورے پہ نکل گیا۔بالکل کاؤ بوائے فلموں والا ماحول تھا۔ریت اگلتے صحراؤں میں ویران سٹیشن اونگتے ہوئے سٹیشن ماسٹر اور پوسٹ ماسٹر۔وہیں مجھے ڈپٹی پوسٹ ماسٹر جرنل کا فون آیا کہ اکرم اپنی ریٹائرمنٹ کی درخواست واپس مانگ رہا ہے۔میں نے تاکید کی کہ درخواست پارٹ آف فائل ہے۔اب واپس ہونے سے رہی۔معاملہ لٹکائے رکھنا۔میں اسکی غیرت سے حسد کر رہا تھا۔

میں دورے سے واپس لوٹا تو اکرم بالکل ہی سوکھ چکا تھا۔دور سے ہی سرکاری افسر لگ رہا تھا۔جوش اترنے کے بعد اسے خیال آیا کہ سرکاری مکان اردلی ماہانہ تنخواہ اور افسری کے خول سے باہر نکلنا ہوگا۔جہاں ضروریات زندگی منہ کھولے کھڑی ہیں۔دریائے بیجی اب دریائے ناڑی بن چکا تھا۔آرام سے سیوی کے کنارے لیٹا اونگھتا ہوا۔کئی ایک درخواستیں بھی افسروں کی بھی آچکی تھیں کہ اکرم والا مکان انہیں الاٹ کیا جائے،جونیئر گریڈ میں ہلچل بھی تھی کہ اکرم کا چارج انہیں دیا جائے۔ادھر گھر میں بیوی تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی کہ بچوں کو بھوک سے مارو گے مورکھ۔اکرم کا بس چلتا تو نثار والے اسی رسے سے سرکل آفس کے شعبہء تحقیقات میں لٹک جاتا۔مگر وہ رسہ بھی رسہ گیر ساتھ ہی لے کر چلتے بنے تھے کہ کیس پراپرٹی ہے۔

اکرم یوں تو دندناتا دفتر میں داخل ہوا کرتا۔مگر اب وہ خاکساری تلے دبا ہوا۔پی اے سے بازیابی کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ملک کا سچا اور کھرا سرکاری ملازم اس کے چہرے پہ ناگ کی گرم دھول چپکی ہوئی تھی۔

حال احوال کے بعد اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔

''وہ میرا جذباتی فیصلہ تھا مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے''

وہ تو تک کی اجتماعی قبر سے نکلی ہوئی تیزاب سے منہ جلی لاش سا کچھ بول نہ سکتا تھا۔لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر بکھر کر نکل رہے تھے بے ربط سے۔میں نے سمجھایا۔

''یہ دوقومی نظریہ جس پہ ہمارا ملک الگ ہوا کوئی نیا نہیں ہے۔ہندوستان میں بھی دوقومیں تھیں،حاکم ٹیکس لینے والی،عیاشی کرنے والی تیس فی صد اور جوتے کھانے والی گیہوں کاشت کرنے اپنی بہن بیٹیاں ان کے شبستانوں میں بھجوانے والے اپنے بیٹے ان کی جنگوں میں قتل کروانے والے ستر فی صد۔ہم نعروں پہ پلنے والی اکثریت ہیں۔مذہبی،سیاسی،قومی نعروں پہ پلنے والے۔جیسے گندے جوہڑ کے کیڑے صاف پانی میں ڈالیں تو پھڑک پھڑک کر فوراً ہی مرجائیں،ہم اندھیرے گھروں میں نسل در نسل زندگی بھوگ کر اپنی قبروں کو روشن کرنے والے لوگ ہیں۔دن میں بار بار سر پہ ہتھوڑے برسا برسا کر ہمیں سدھارا جاتا ہے''

اکرم کی یہ حالت کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔میں نے دراز سے استعفٰی نکال کر اسے واپس کر دیا۔اکرم اپنا ہی استعفٰی میز پہ پڑا دیکھتا رہا۔جیسے کوئی انہونی چیز ہو۔اچانک ہی اس کے چہرے کی رنگت بدلنے لگی۔

''تو یہ نظام کون بدلے گا؟ کون سا ملک؟ ہمیں ہی یہ بدلنا ہوگا۔پاکستان قائم ہوتے ہی دوقومی چھوڑ کر یک قومی اختیار کرنا چاہیے تھا۔نصابوں میں بھی داخل کر دیتے''

مجھے خوشی ہوئی کہ اب تک ہم پورے مردہ نہیں ہوئے۔سپارٹیکس کی کچھ روح ہم میں زندہ ہے۔

''نظام بدلنے کے لیے ہمت چاہیے۔انقلاب میں بہت سے لوگ مرتے بھی ہیں۔آزادی خیرات میں تو نہیں ملتی۔سر سے کفن باندھ کر باہر نکلنا پڑتا ہے''

اچانک ہی اکرم کا چہرہ ایمان سے دمک اٹھا۔جیسے سینٹ تھامس بیکٹ نے پانی سے بپتسمہ دیا ہوا۔

''یہ دوقومی نظریہ یہ قد آدم بت آخر تو کسی کو توڑنا ہوگا۔کسی کو تو منگل پانڈے بننا ہوگا۔میں اس جہاد کی ابتداء کرتا ہوں''

اس سے پہلے کہ کچھ سوچ سکتا اس نے درخواست دوبارہ میرے منہ پہ اچھال ماری۔اور باہر نکل گیا۔

کون مجھے بتلائے

فاطمہ حسن

کون مجھے بتلائے کہ "میرا"
جوگن بن کے خوش تھی
یا ناخوش ہی رہی
وہ دیوانی برہا کیسے جھیل گئی
دکھ کی لہر اٹھی تو کیسے من کو شانت کیا
آنسو کیسے روکے کب کب گیت لکھے
پریم کی روگی ناچتی تھی، کہ تھک جائے
سپنے کی وادی میں جائے
چرن چھو آئے۔
اس کو درشن ہوتا تھا کیا
پریمی اس سے ملتا تھا
کچھ کہتا تھا
کون مجھے بتلائے۔
شکتی میرا کی، مل جائے
تو میں بھی اپنے آپ کو جوگن روپ میں ڈھالوں۔
بن،سمندر صحرا گھوموں
،اس کو ہر منظر میں دیکھوں
عشق کی منزل پالوں۔

امرود کی مہک

ارشد رضوی

وہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑی، دوپہر تھی اور راستے دھوپ سے اٹے پڑے تھے' گلیاں سنسان تھیں' تیز تیز چلنے سے اس کا سانس اس کے سینے میں چھپا شور مچاتا تھا اور نازک سا ہاتھ میرے ہاتھ کی سختی میں چھپا آہستہ آہستہ کسمساتا تھا' یہ گرمیوں کے دن تھے، بند کھڑکیوں والے گھر حیرت سے ہمیں دیکھتے تھے لیکن خاموش تھے، ہاں صرف ایسا لگا تھا کسی نے ایک مکان کی چھت سے جھانکا ہے، اسے لگا تھا تبھی میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جہاں آنکھیں اور ہونٹ کھدے تھے میں نے اس سے کہا تھا کوئی نہیں ہے، محض واہمہ ہے جوان تیز دوپہروں میں ہمیں آن لیتا ہے، لیکن اسے لگا تھا اور اس نے پھولتے جاتے سانسوں کے ساتھ کہا تھا دو آنکھیں تھیں اور دو ہاتھ، وہاں اس چھت پر میں نے دیکھا تھا' چھت ویران تھی اور پلنگ پر تنہائی دھوپ کے ہاتھوں جل رہی تھی' شاید وہ خوفزدہ تھی تبھی اس کا چہرہ کچھ کچھ بدل رہا تھا اور وہ خوشی جو چلتے وقت اس کے چہرے پر کسی جھرنے کی طرح بہتی تھی، اب اس کی آنکھوں میں جمع ہوتی جاتی تھی اور بساند اوڑھے جھانکنے لگی تھی لیکن یہ ضرور ہوا تھا کہ بہت سی گلیاں طے کر آئے تھے جو پیچھے رہ گیا تھا ایک ماضی تھا اور آگے ایک بوڑھا برگد کا درخت' جسکی شاخیں دور تک پھیلی تھیں، یہاں ہم کچھ ٹھہر گئے۔

''میں نے دو آنکھوں کو دیکھا تھا جو چھت سے جھانکتی تھیں'' اس نے کہا

''تمہارا وہم تھا'' میں نے اس کی لرزتے ہاتھ پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

''نہیں یہ وہی آنکھیں تھیں جو میرا پیچھا کرتی رہی ہیں'' ''اس دن بھی جب رات میں چھت پر ملے تھے یہ دور سے دیکھتی تھیں''۔

میں نے دیکھا اس کے بے حد جاندار ہونٹوں پر کہیں کوئی وسوسہ تھا جو رینگ رہا تھا اور سینے کا سانس صحیح طرح بیٹھ نہیں پا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا اب تنے نے ہمیں چھپا رکھا ہے اور گھروں کے لوگ سوئے پڑے ہیں، اس نے کہا ہوسکتا ہے کوئی درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا ہو'' وہاں تو پرندے ہیں' لیکن دیکھا ان کی پھڑ پھڑاہٹ اسے ڈرا رہی ہے اور گہرا کھائی سا خوف اسے ستا رہا ہے، تبھی میں نے اسے خود سے لپٹا لیا اور محسوس کیا، وہ حد درجہ ملائم ہے اور اس کے جسم سے ایسی خوشبو آتی ہے جو مر جانے والوں کی یاد میں ہوتی ہے، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ مجھ سے لپٹ کر دل نہیں لگا پا رہی کہ اس کی رگوں میں جو خون بہے جاتا ہے وہاں خوف کے جھینگر بولتے ہیں، میں نے اس کا بوسہ بھی لینا چاہا لیکن اس نے منہ موڑ لیا اور جاندار ہونٹوں کو بے جان شکل سا بنا لیا تو گویا وہ اب خوش نہیں تھی' اتنی تیز دھوپ میں جلتی گلیاں طے کر کے اب وہ پچھتا رہی تھی اور اسے لگتا تھا کوئی کہیں موجود ہے اور اسے دیکھ رہا ہے، اب بولتا ہوں تو جواب نہیں دے رہی اور اس کی آنکھیں پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونک چونک جاتی ہیں۔

اس رات جب ہم ملے تھے تو چاند پگھل رہا تھا، چھت اکیلی تھی، تبھی مجھ سے لپٹے لپٹے اس نے سرگوشی کی تھی کہ میں اسے کہیں لے جاؤں جہاں بس ہم دونوں ہوں اور یہ جو چاند پگھل رہا ہے یہ بھی نہ ہو' میں نے اسے سمجھایا بھی تھا لیکن وہ بضد تھی اور بار بار کہے جاتی تھی یہاں تک کہ ہم بے حال ہوگئے تھے اور نیم برہنہ دیوار کے اسی سائے میں پڑے رہے تھے جو چاند نے بنایا تھا' میں نے اسے لباس کو سرسراتے سنا تھا اور یہ بدن کو پھنکارتے جیسے کوئی مادہ سانپ ہو اور خود ہی خود اترتا جو تبھی میں نے اسے کہا تھا کسی تیز دھوپ والے دن ہم اس جگہ کو چھوڑ دیں گے اور وہ دن ا؟ گیا تھا۔

آسمان پر صرف سورج تھا، ایک بھی بادل کا ٹکڑا دھوپ کے اترنے میں حائل نہیں تھا، وہ بھرے بھرے گھر میں سب کو سلا کر میرے ساتھ نکلی تھی، بہت جلدی میں پہنے گئے لباس میں وہ کسی جنگلی جانور سی دکھتی تھی، وہ کئی گلیاں تو طے کر پائی تھی پھر کسی خوف نے اسے جکڑ لیا تھا کہ کوئی دیکھتا ہے خاص طور پر دو آنکھیں جو چھت پر موجود تھیں، یہ بات اس نے مجھ سے پہلے بھی کہی تھی، میں جس گلی کے کونے پر کھڑا تھا وہ وہاں سے گزری تھی اور گزرتے وقت اس نے کچھ ایسا ہی کہا تھا اور ایک مکان کی طرف اشارہ بھی کیا تھا' جس کی کھڑکیاں باہر نکلی ہوئی کچھ ایسی ہی لگتی تھیں جیسے سب کچھ دیکھ رہی ہوں' لیکن یہ سب وہم تھا جوان گلیوں میں جگہ جگہ رہتا تھا اور ایک گلی تک جاتے جاتے یہ اتنی شدت اختیار کر جاتا کہ وہاں کے مکان ان کے در' کھڑکیاں اور چھتیں عجیب عجیب اشکال بنائے' کبھی ڈراتیں اور کبھی باتیں کرتیں اور جلدی جلدی چل کر اس گلی کو عبور کیا جاتا۔

اس گلی سے تو ہم نکل آئے تھے اور برگد کے موٹے تنے کے پیچھے چھپے تھے لیکن وہ اپنے آپ میں نہیں آپا رہی تھی اور اس کے چہرے کا حسن کھنڈی ہوئی زردی گانٹھ بنتا جاتا تھا۔

''مجھے واپس جانا ہے' وہ بڑبڑائی تھی۔

''سب اٹھ گئے ہوں گے اور مجھے تلاش کرتے ہوں گے''۔ وہ دوبارہ بڑبڑائی تھی اور اکیلے ہی چل رہی تھی، میں نے اسے آواز دی تھی لیکن لگتا تھا بھری ہے اور واپس جاتی گلیوں کی طرف چلتی جاتی ہے، پھر ایک موڑ اسے چھپا گیا تبھی شام اتری اور میں نے برگد کے درخت پر چھوٹے اور بڑے پروں والے پرندوں کو اترتے دیکھا، وہ راستہ جو برگد کے درخت

سے آگے جاتا تھا ویران تھا اور دور سے نظر آتی سڑک پر چلتی گاڑیوں کی روشنیاں بولنے لگی تھی، میں بھی واپس ہوا اور دیکھا شام ڈھل رہی ہے اور مکانوں پر اندھیرا اتر رہا ہے۔ اور اترتے اترتے کچھ کہہ رہا ہے میں نے کچھ سنا نہیں اور اپنے گھر تک آیا جہاں جھریوں بھری ماں بیٹھی تھی، جس کے اردگرد دبے پاؤں آتی بیماری صحن کو مایوس کیے دیتی تھی، پھر اور لوگ بھی آ گئے، بڑی بھابھی پیٹ سے تھی جاتی شام کچھ دیر صحن میں رکی تھی، پھر اندر کے کمروں سے کہیں چھپ گئی تھی، میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور ماں سے اس کی طبیعت کی بابت پوچھنے لگا، ماں کچھ نہیں بولی وہ ہمیشہ کی طرح مجھ سے ناراض تھی، بھابھی اپنے بھاری پیٹ کے ساتھ سامنے آن کھڑی ہوئی، اس کے چہرے پر کچھ سوجن تھی، پیچھے وہی کمرہ تھا جہاں بھائی کچھ لکھ رہے تھے، انہیں لکھنے کا جنون تھا وہ بہت دنوں سے کسی ناول پر کام کر رہے تھے۔ ان کی پہلی دو کتابیں ناکام ہو چکی تھیں اور یہ تیسری کتاب تھی جس پر وہ دن رات کام کر رہے تھے، صحن کے کونے میں جہاں امرود کے درخت تھے وہیں سے سیڑھیاں اوپر چڑھ رہی تھیں، مجھے معلوم تھا کہ صحن میں جو ایک پُراسراری بو پھیلی ہے وہ انہیں درختوں سے آتی ہے جن کے پتوں میں امرود چھپے ہیں، سیڑھیاں چڑھتے ہوئے یہ بُو تیز ہوگئی پھر دور ہوتی گئی کہ میں چھت پر آ گیا تھا، وہاں سے اس کی چھت نظر آتی تھی، وہ ویران تھی، تبھی مجھے یاد آیا وہ شام کے بعد آنے والے سرمئی اندھیرے میں چھت پر نہیں آتی لیکن میں نے دیکھا اندھیرا تو گہرا ہوا جاتا ہے اور آسمان کی پٹی پر چاند ستاروں کا میلہ لگا ہے لیکن وہ موجود نہیں، ورنہ تو وہ مخصوص لباسوں میں چھت پر آ جاتی ہے لیکن وہ نہیں تھی، میں نے تو اسے ایک گلی کا موڑ مڑتے دیکھا تھا اور اس کی چال کی بہتی ندی میں کچھ بھنور بنتے پھر وہ چھپ گئی تھی۔ میں ایسا کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ محلے کی گلیوں میں شور اٹھا، یہ شور ایک گلی جس پر اس کا مکان دھرا تھا وہاں سے بہتا بہتا تمام گلیوں تک پہنچا تھا، مجھ تک جو بات پہنچی وہ اسی کے بارے میں تھی، ساری باتوں کو اگر ایک جملے میں لکھا جائے تو وہ یوں ہوگا:

''وہ دوپہر میں گھر سے نکلی تھی جب سب گھر والے سوئے پڑے تھے اب جب اٹھے ہیں تو اس کا دور دور تک پتا نہیں''

یا یوں کہ:

''وہ کسی کے ساتھ بھاگ گئی''

میں خاموشی سے سیڑھیاں اترا، یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کی چھت ویران پڑی تھی اور دو آنکھیں جو اسے دیکھا کرتی تھیں ان کا بھی دور دور تک نشان نہیں تھا، ہاں یہ ضرور تھا کہ پتوں میں چھپتے امرود صاف دکھائی پڑتے تھے اور ان کی بو سیڑھیوں پر ہمیشہ سے موجود تھی۔

سکیچ

سلیم شہزاد

ایک ذرا سی،
بے دھیانی میں ''بارش دیوتا''
ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا ہے
گیان، ویان منتر وَنتر بے سود ہوئے ہیں
بُدّھا کے مندر میں رسمیں جاری ہیں
یعنی
برگد سوکھ گیا ہے
سب ہی دعائیں، اپنا رستہ
کھو بیٹھی ہیں
''یار ذرا تم دیکھو ناں''
رنج اور لمس کی وادی میں
میں بھی تو اک برگد ہوں
''اور'' سوکھ گیا ہوں!

بہاؤ اور کنارا

توقیر چغتائی

کہیں جانے سے پہلے
احتیاط کھانس لیتا ہوں
نہیں آتی مگر یہ چاہتا ہوں
چھینک آ جائے
اگر محفل میں ہچکی آ گئی
کیا لوگ سوچیں گے
کہاں آداب آتے ہیں
مجھے لوگوں سے ملنے کے
نہیں معلوم سب کے سامنے
کھانے کا کیا اچھا طریقہ ہے
نوالہ توڑتے ہیں کس طرح
کیسے چباتے ہیں
کئی دن سے اگر ہو پیٹ خالی
کیسے کھاتے ہیں
ابھی کچھ روز پہلے
ایک دعوت میں
اچانک آ گئی تھی چھینک
پانی پی رہا تھا جب
اور اس سے ایک ہفتہ قبل ہوٹل میں
یکا یک چائے کی پیالی
مرے ہاتھوں سے چھوٹی تھی
نہیں بولا تھا وہ لیکن
بہت کچھ اس کے ماتھے کی
لکیروں سے ہی ظاہر تھا
مجھے ایسا لگا وہ کہہ رہا تھا اب ضرورت ہے
تمہیں جیون کی راہوں پر کسی اچھے سہارے کی
مگر ہم ایک دوجے کا سہارا بن نہیں سکتے
ہماری عمر رشتوں کی روانی کا سمندر ہے
بہاؤ بن تو سکتے ہیں کنارا بن نہیں سکتے

کپاس کا تاجر اور بڑھیا

صدرالدین عینی/شاہ محمد

پیر کا دن تھا۔ میں مدرسہ میر عرب کے بیرونی صحن کے مغربی کنارے میں چھوٹی مسجد کے دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس روز بازار میں خاموشی تھی۔ شاید اس لئے کہ منڈی اگلے دن لگتی تھی۔ اُس روز وہاں نہ خریدار تھے اور نہ بیچنے والے۔ فقط کپاس کے چند ڈھیر خوابیدہ پڑے تھے گویا اپنے مالکوں کے انتظار میں ہوں۔

مدرسہ کی صحن کے کونے میں جہاں میں بیٹھا تھا وہاں قریب ہی تین آدمیوں نے ایک دری بچھا رکھی تھی اور اس پر بیٹھے چائے پی رہے تھے اور روٹی کھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک حاجی ذاکر بائے تھا۔ وہ گلا بیان کا رہائشی اور کپاس کا بڑا تاجر تھا۔ اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ اور ستر برس کے قریب تھی۔ اس کا اصلی نام گو کہ ذاکر بائے تھا مگر پچھلے سال حج کر کے واپسی پر اس کے نام کے ساتھ لفظ ''حاجی'' بھی شامل ہو گیا۔ اُن تینوں آدمیوں سے ایک بائیس سالہ نوجوان تھا جس کی مونچھ ابھی ابھی نکل رہی تھی۔ اس نوجوان کا نام ہاشم تھا اور وہ حاجی ذاکر بائے کے گلا بیان علاقے کا اُس کا پڑوسی تھا۔ یہ نوجوان بازار میں کپاس تولنے کا کام کرتا تھا اور ترازو ٹھیک کرتا تھا۔ حاجی ذاکر کا ایک بیٹا تھا کامل جان، جو ہمارے عجد وانی طالبوں کا واقف تھا اور ملا حامد صوتی کے ہجرے میں آمد و رفت رکھتا تھا۔ اُسے پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ اس مناسبت سے میں اس کے کاموں سے ایک حد تک واقف ہو گیا تھا۔

عجد وانی لوگ حاجی ذاکر کو کپاس فروشی میں ''بہت ناانصاف'' کہتے تھے۔ مگر کہتے تھے کہ حج کرنے کے بعد اس نے گناہوں سے توبہ کر لی اور وہ ''خدا ترس اور پرہیز گار بن گیا''۔ میں بھی عجد وانیوں کی طرح ایمان رکھتا تھا کہ حج سے انسان پاکیزہ ہو کر آتا ہے۔

اُن میں سے تیسرا شخص مراد تھا جو ستر سال کا خمیدہ، سفید چہرے والا تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ خشک سیب سے مشابہ تھا۔ یہ شخص جوانی میں کپاس کی بوریاں اٹھاتا تھا اور اب جب کہ ہاتھ اور کمر کام سے جاتے رہے تو وہ کپاس بازار میں چوکیداری کرتا ہے۔

حاجی ذاکر چائے نوشی کے دوران اُن لوگوں کے ساتھ اپنے حج کے سفر کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ کس طرح اس نے مدینہ میں پیغمبر صلعم کے روزضہ کی زیارت کی، اور مکہ میں خانہ کعبہ کی۔ اس نے عرب شیوخ کے الفاظ دوہرائے کہ جو کوئی بھی کعبہ میں داخل ہوگا وہ تمام گناہوں سے پاک ہوگا اور ماں سے نوزائیدہ بچے کی مانند ہوگا۔

اسی دوران چوک پہ ایک معمر عورت نمودار ہوئی جس کا برقع جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک عصا تھی۔ اس کے آگے آگے ایک تھکا ہوا بوڑھا گدھا آ رہا تھا جس پر کپاس کا بھاری بوجھ لدا ہوا تھا۔ اس بوڑھی عورت کو چوک خالی نظر آیا تو وہ اپنی لاٹھی پر ٹیک لگائے حیران کھڑی ہو گئی۔

حاجی ذاکر نے ہاشم سے کہا:

''جاؤ، اس بڑھیا کا کپاس تول کر میرے ڈھیر میں ڈال دو۔ لیکن اس طرح تولو کہ آج چائے، روٹی اور گوشت کا خرچہ نکل آئے''۔

''اگر تم ٹھیک ٹھیک تولنے کا کہہ دیتے تو دل و جان سے خدمت کرتا حاجی عمک.....'' ہاشم نے کہا..... ''لیکن.....''۔

اس نے ''لیکن'' کے بعد کچھ نہ کہا اور نگاہیں زمین پہ گاڑ دیں۔

..... ''لیکن چوری نہیں کروں گا'' یہی کہنا چاہتے ہو نا؟'' حاجی ذاکر نے ہاشم سے سوال کرتے ہوئے غصہ سے کہا۔ ''بڑے آئے پاکباز شیخ۔ کل تم نے چوری نہیں کی تھی؟''۔

''ہاں، کی تھی۔ اور آئندہ بھی چوری کروں گا۔ مثل مشہور ہے کہ'' خواہ کپاس کا دل سفید ہو مگر ''کپاس بازار'' کا دل کالا ہے''۔ سیاہ دل تاجروں اور ترازو داروں کے بیچ رہ کر میرا دل سفید نہیں رہ سکتا۔ لیکن اس بڑھیا سے چوری نہیں کروں گا''۔ اس جوان نے بلند اور تیز لہجے میں کہا۔

''کیوں؟'' حاجی ذاکر نے تعجب سے پوچھا۔

''اگر اس ضعیفہ کا کوئی وارث ہوتا تو وہ اس برے حال میں بازار نہ آتی۔ اس بڑھیا سے ایسی بیکسی نظر آتی ہے کہ اگر زندہ رہی تو اس کپاس کے پیسوں سے اپنے موسم سرما کا خرچہ نکال سکے گی اور اگر مر گئی تو یہ پیسہ گوروکفن پہ جائے گا۔ میں جوان اور تندرست آدمی ہوں۔ میں ایک درماندہ بڑھیا کے زمستان کا خرچہ، اور گوروکفن کا پیسہ چرانے سے ڈرتا ہوں''۔ نوجوان نے کہا۔

''بہت خوب''۔ حاجی ذاکر نے جوان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اپنی جوان جسم کی وجہ سے ڈرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ اس بڑھیا کہ بددعا سے آج رات ہی مر جاؤ۔ مگر بڑھاپے میں جان سخت ہو جاتی ہے.....''۔

''خصوصاً حج کرنے کے بعد گناہوں سے پاک ہو کر آ جانے سے'' مراد نے حاجی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''برک اللہ'' کہہ کر حاجی ذاکر نے مراد کی بات کی تحسین کی اور اپنی بات جاری رکھی۔

''میں خود جا کر اس بڑھیا کا کپاس اپنی مرضی کے مطابق تولوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں اس بڑھیا کی بدعا سے نہیں ڈرتا۔ فرض کرو اس بڑھیا کی بدعا سے مر بھی جاؤں تو کم از کم آج رات بہترین گوشت کھا کر مر جاؤں گا''۔

حاجی ذاکر روانہ ہوا، صحن کے زینے اتر کر آہستہ آہستہ بڑھیا کے پاس چلا گیا اور گفتگو شروع کی۔

''بہن۔ کیسا کپاس ہے آپ کا۔ زیادہ پکا ہوا ہے، یا صاف اور اچھا ہے؟''۔

''ہاں ہاں صاف ہے''۔ بڑھیا نے کہا'' میزان ماہ کا چاند ابھی نہیں نکلا، تو یہ زیادہ پختہ کیسا ہوسکتا ہے؟''۔

''ہوسکتا ہے کہ یہ پچھلے سال کا کپاس ہو'' حاجی ذاکر نے کہا'' اگر اجازت ہو تو گدھے سے بارا تار دوں؟''۔

''تمہارے لیے دعا کروں گی''۔ بڑھیا بولی'' مجھ میں تو کھڑا رہنے کی بھی سکت نہیں''۔

حاجی ذاکر نے گدھے سے بوجھ اتار دیا' اس کا منہ کھولا اور کپاس کا معائنہ کیا:

''آپ کا کپاس برا نہیں ہے۔ البتہ بہت خشک اور ہلکا ہے۔ دلال اُسے خوشی خوشی سے لے لیتے۔ افسوس کہ آج بازار میں خریدار نہیں ہیں۔ آپ کیوں بے بازار والے دن آئی ہیں۔ اگر بازار کا دن ہوتا تو فوراً آپ کا کپاس بیچ کر آپ کی خدمت کرتا''۔

حاجی ذاکر نے بوری کا منہ دوبارہ باندھ لیا اور کنکھیوں سے بڑھیا کو دیکھتا ہوا کھڑا رہا۔

'' کتنے نا ترس لوگ ہیں'' بڑھیا بولی'' میرا خاوند آپ سے بھی بوڑھا تھا، مگر اس کے باوجود اس نے دو بیل مانگے اور یہ کپاس کاشت کی۔ مگر خدا رحمت کرے، خدا کی بندگی بجالایا (مر گیا)۔ میں اس کے گور و کفن کے خرچے کے لئے مقامی امیر کی مقروض ہوگئی ہوں۔ مالیات کا افسر ہر روز ٹیکس کی رقم مانگتا ہے۔ خود میں نے ایک ماہ سے گرم طعام نہیں دیکھا اور ہمسایوں سے چند روٹیوں کی مقروض ہو چکی ہوں۔ مگر پندرہ روز سے کوئی ایسا نہ ملا جو اِسے بازار لاتا اور میرے لئے فروخت کرتا.....

بڑھیا کے باتونی پن سے حاجی ذاکر تنگ آیا۔ اس نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا:

''خوب۔ آج ہی کپاس بیچو گی؟''

''ہاں اگر خریدار ملے تو آج ہی نہ بیچ دوں''

'' آپ دیکھ تو رہی ہیں کہ خریدار نہیں ہیں۔ میں حیران ہوں کہ بے بازار والے دن آپ اپنا کپاس کیوں لائی ہیں؟''۔

''میں بھی اس بات کا جواب دینا چاہتی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے بات لمبی ہوتی جاتی ہے''۔ بڑھیا نے عذر خواہانہ انداز میں کہا'' میں اس بچے کچھے کپاس کو اپنی پشت پر لاد کر تو نہیں لا سکتی تھی۔ میرے پاس گدھا ہے نہیں۔ میرا ایک ہمسایہ بار برداری کا کام کرتا ہے۔ وہ فقط سوموار کے روز اپنا گدھا دینے پر راضی ہوا'' دوسرے دنوں میں میں خود بازار جاتا ہوں' وہ بولا۔ اس لئے لاچار ہو کر آج لائی ہوں''۔

'' اچھا۔ آج خریدار نہیں ہے۔ اب کیا کیا جائے؟'' حاجی ذاکر نے پوچھا۔

'' تم میری مدد کرو۔ ارزان تر جائے بھی کسی کے ہاتھ فروخت کردو۔ میں اسے کہاں اٹھائے اٹھائے پھروں گی۔ اگر واپس لے بھی جاؤں تو بھی دوبارہ بازار لانے کی سکت نہیں رکھتی۔ بے کسی بری چیز ہوتی ہے''۔

یہی وقت تھا بڑھیا کو لوٹنے کا۔ اس لئے کہ اس نے ایک مردہ کے بطور خود کو حاجی ذاکر جیسے مردہ دھونے والے کے حوالے کر دیا۔ حاجی نے بڑھیا سے کہا:

''اچھا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں ثواب کا کام کرتا ہوں۔ لوگ مساجد و مدرسے تعمیر کرتے ہیں، میں ایسا کرنے کی سکت نہیں رکھتا، اس لئے آپ کا دل جیتوں گا.....۔

'' اللہ ایمان سلامت رکھے۔ اپنے پوتوں پڑپوتوں کی شادیاں اپنے ہاتھوں سے کرو'' (لمبی عمر پاؤ)''۔ بڑھیا نے حاجی کی بات کاٹتے ہوئے دعا کی۔ حاجی نے بات جاری رکھی۔

''میں آپ کے کپاس کا نرخ کم نہیں کروں گا۔ اسے تول کر مقررہ قیمت اپنی جیب سے دوں گا۔ کل اسے بازار لگنے پر بیچ دوں گا اور اپنا پیسہ وصول کروں گا۔ میرا پیسہ کل تک قرضِ حسنہ کے بطور آپ کے کپاس میں بند رہے گا، خدا کسی اور جگہ سے دے گا''۔

بڑھیا نے دل کی گہرائیوں سے حاجی کو دعا دی۔ اور ذاکر کپاس کو ترازو میں ڈالنے لگا۔

جس وقت حاجی ذاکر بڑھیا سے گفتگو کر رہا تھا مراد ہاشم سے کہہ رہا تھا: ''ہمارے گاؤں میں ''نسیم'' نامی ایک خرکار رہتا تھا۔ وہ اپنے گدھوں کی خوب دیکھ بحال کرتا تھا۔ وہ بخارا اور وابکند، اور بخارا اور مرزا بہاؤ الدین کے درمیان بار برداری کرتا تھا۔ پچھلے سال وہ ایک مصیبت میں گرفتار ہوا۔ ڈاکوؤں نے ایک راہ گیر کو جوار کے فصل میں قتل کر دیا اور اس کے پاس جو کچھ تھا لوٹ لیا۔ شریعت کی رو سے جس کسی کی کھیت پر کوئی واقعہ ہو جائے، اگر مجرم کا پتہ نہ چلے تو زمین کا مالک گنہگار تصور ہوگا۔ اسی بنا پر اہل کار اسے پکڑ کر لے گئے اور جیل میں ڈال دیا۔ ایک سال کے عرصے میں اس کا بھائی اس کے گدھے اور جوار والی زمین بیچ کر اس کی رہائی کے لئے اہلکاروں کو دیتا رہا۔ مگر وہ رہا نہ ہوا۔ آج میں نے سنا ہے کہ امیر (بادشاہ) نے نسیم کو موت کی سزا سنا دی۔ آج اہلکاروں نے خرکار

کے بھائی کو کہا کہ اگر آج رات دو ہزار تنگے (روپے) نہیں لاؤ گے تو صبح سویرے تمہارا بھائی مار دیا جائے گا۔'' مگر اس کا بھائی دو ہزار تو کیا دو تنگے تک نہ لا سکا''۔

مراد نے کہانی کے آخر میں کہا:

'' اگر میں امیر (بادشاہ) ہوتا تو نسیم خرکار کی بجائے حاجی ذاکر بائے کو سزائے موت دیتا۔ یہ جلّادِ بے خنجر روزانہ کئی کسانوں کا خون بہاتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ'' مالِ مومن، خونِ مومن''۔ اب وہ اُس بڑھیا کو قتل کرنے لگا ہے''۔

اسی وقت انہیں بڑھیا کی فریاد سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی:

'' میں نے خود اپنے ہاتھوں سے اسے چھوٹی ترازو میں تولا اور لائی۔ اس خدشے میں کہ کہیں بازار میں کم نہ نکلے، میں نے ترازو بان کا حق بھی اس میں شامل کرلیا''۔

'' اچھا۔ بتاؤ کتنا ہوا تھا؟'' حاجی ذاکر نے پوچھا

ہر بار پانچ پانچ پاؤنڈ کا وزن کرتی رہی ہوں۔ میں نے دوبارہ یقین کر لیا کہ کہیں غلطی تو نہیں کی۔ میں بالکل ٹھیک بول رہی ہوں۔ ایک سو پچیس پاؤنڈ۔ اور تم اسے اسّی بنا رہے ہو؟''۔

حاجی ذاکر بڑھیا کو حقارت سے برا بھلا کہتے ہوئے کپاس بوری میں دوبارہ ڈالنے لگا۔ اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگا: '' لوگوں نے کتنا سچ کہا ہے کہ'' خدمت میں تہمت''۔ اس نے بڑھیا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

'' مگر کیا میں تمہیں فریب دینے کے لئے پچھلے سال چار ہزار تنگہ خرچ کر کے حج کرنے گیا تھا؟۔ اپنا کپاس اٹھا، اور چلی جا۔ تمہارے مرنے کے بعد تمہارے گاؤں کے لوگ اسے بیچ کر تمہارا گور و کفن کر دیں گے.....

بڑھیا ڈھیلی پڑ گئی:

'' میں اسے واپس لے جانے کی سکت نہیں رکھتی۔ جو کرنا ہے کرو، میں خدا کے حوالے کرتی ہوں.....'' اس نے کہا۔

'' اس نے خدا کے حوالے کر دیا'' حاجی ذاکر نے خود سے کہا اور بڑھیا کی طرف دیکھا اور اپنی بات جاری رکھی.....'' کیا خدا کے پاس کرنے کو اور کوئی کام نہیں؟''۔

آخر حاجی ذاکر بائے نے بڑھیا کی فریادوں التجاؤں کے بعد اس کے کپاس کو اپنے ڈھیر میں ملا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے بڑھیا کو کتنے پیسے دیے۔ بڑھیا نے وہ رقم گنے بغیر اپنے دوپٹے کے پلو میں باندھ لی، خالی بوری گدھے پر پھینک دی اور اپنی عصا ٹیکتے ہوئے اور گدھے کو ہانکتے ہوئے بازار سے باہر نکلی۔ مجھے خیال آیا کہ وہ کسی کی مدد کے بغیر گدھے پر سوار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسے گدھے پر سوار ہونے میں مدد دینے تیز تیز چلا گیا۔

لیکن اس نے یہ قبول نہ کیا:

'' میں بوڑھی ہو چکی ہوں۔ گدھے پر نہیں بیٹھ سکتی۔ اللہ تمہاری اچھی نیت کا اجر تمہاری مرادیں پوری کر کے دے''۔ یہ کہتی ہوئے اور مجھے دعا دیتی ہوئی جھریوں بھرے چہرے پر رواں آنسوؤں کے ساتھ بازار سے نکلی اور چلی گئی۔

میں کپاس بازار سے نکلا اور سیدھا پیرک کے حجرے چلا گیا اور اس کو مراد کی گفتگو سنا دی اور اگلی صبح سویرے نسیم خرکار کی پھانسی کا احتمال ظاہر کیا۔ اور اس سے التماس کی کہ صبح سویرے سزائے موت والی یہ آدم کُشی دیکھنے میرے ساتھ ریگستان چلے۔ وہ مان گیا۔ میں اپنے حجرے واپس ہوا۔ میں بہت مغموم تھا اور میرا خیال اُسی بڑھیا کی طرف تھا۔ میں رات کو نہیں سویا جب بھی آنکھ بند کرتا مجھے عصا ٹیکتی روتی بڑھیا بازار سے جاتی ہوئی نظر آتی۔

☆

صادق مری

میں بڑھ کے گلے سے بھی لگاتا انہیں صادق
لے کر وہ لبادے میں جو خنجر نہیں آتے

بچھڑے ہوئے اب ہم کو میسر نہیں آتے
صحرا سے بگولے تو پلٹ کر نہیں آتے

دامن پہ گریں یا کہ سرِ خاک ہوں ارزاں
آنسو ہیں کبھی لوٹ کے یہ گھر نہیں آتے

رہنا ہے قفس میں مجھے آباد بہت دن
جب تک کہ مرے بال مرے پَر نہیں آتے

مَیں ان کی کشش میں رہا برباد بہت دن
یہ خواب جو آنکھوں میں سمٹ کر نہیں آتے

جب تک کہ نہ مہناز دے خود اپنی گواہی
انجیر کے پیڑوں میں یہ تیور نہیں آتے

جلتا ہے چراغوں کا لہو صبحِ اذاں تک
وہ رات کہ جس میں مہ و اختر نہیں آتے

ریمائنڈر

حسن مسعود

میں گزشتہ دو سالوں سے اُچھ جیل میں قید ہوں۔جیل کے بیرکوں کی دیواریں، "مجھے انصاف دو" _ "مجھے چھوڑ دو" _ میں بے گناہ ہوں_ ""میں، میں پاگل نہیں ہوں" _ "تم لوگ مجھے چھوڑتے کیوں نہیں ہو؟" _ کا راگ آلاپنے والوں کو سُن سُن کر تنگ آ چکی ہیں۔ یہاں روز بدبُو دار بدن، گُھٹن زدہ لاشوں کی مانند گئے پُھٹے چہروں اور خوشحالی سے کہیں دور کسی انجان قبر پر سوئے نشہ آور ادویات لئے انسان سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔لیکن میں اپنے بیرک میں بہت سکون سے رہتا ہوں۔روز صُبح چھت سے اوورفلو ہو جانے والا پانی میرے بیرک میں آجاتا ہے۔اور میری چھت چاروں کونوں سے ٹپکنے لگ جاتی ہے۔اس کی ٹِپ ٹِپ مجھے ریمائنڈر کا کام دیتی ہے۔اکثر پانی پینے والا مٹکا بھی اسی سے بھر جاتا ہے۔اور بعد میں وہی پانی پینے اور غسل کرنے کے کام آتا ہے۔اُسی ریمائنڈر کی بدولت میں فجر کی نماز کھڑے ہو کر پڑھ پاتا ہوں۔

تین فُٹ لمبی اور دو فُٹ چوڑی یہ زمین میں نے جُرم کر کے خریدی ہے۔ بیرکوں سے مُتصل غسل خانوں سے چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔نئے آنے والے نومولود قیدی ہر دوسرے دن پرانے قیدیوں کی طرف سے زیادتی کا نشانہ بنا دیئے جاتے ہیں۔جس بیرک میں میں رہتا ہوں اب اس سے لگاؤ ہو گیا ہے۔جس کا کوئی بھاڑہ نہیں ہے۔جس میں میرے سوا کوئی نہیں سما سکتا۔جس میں رات کے وقت تیز روشنی اور دن میں سخت اندھیرا کر دیا جاتا ہے۔صبح ہوتے ہی جیل انتظامیہ کی جانب سے ناشتہ تقسیم کرنے کے لئے گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔اور اگر ناشتے میں تاخیر ہو تو قیدیوں کی جانب سے برتوں کا اتنا شور کیا جاتا ہے کہ کان کے پردے پھٹنے پہ آجاتے ہیں۔اُن میں سے بیشتر قیدی سر کھجاتے، بیرکوں کی سختیاں جھیلتے، گندگی، جنسی حوس، بیچارگی اور لاپرواہی کی وجہ سے جہالت کے اندھیروں میں غرق اپنا گھر، دوست احباب حتا کہ اپنے آپ کو بھی بھول چکے ہیں۔

میں روز ناشتہ لینے کے لئے ان کے ساتھ کھڑا کسی عجوبے سے کم نہیں لگتا کیونکہ میں نے زندگی کو چھت سے ٹپکتے ریمائنڈر اور حَبس زدہ بیرک تک محدود کر لیا ہے۔مجھے چند ہم خیال قیدیوں کی جانب سے روز بیرک سے رِہا ہونے پر اُکسایا جاتا ہے۔اور کہا جاتا ہے کہ "تم تو بے گناہ ہو" تم ہاہاہاہاتم بھاگ جاؤ"،اُن قیدیوں کے بدبودار دانت اور ان سے نکلنی والی پانی کی پھنوار اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے سے لڑلڑ کر اپنے اگلے دو دو دانت توڑ ڈالے ہیں۔مجھے اب یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک ایسی ریل کا مسافر ہوں جس میں بیٹھے مسافروں کو زندگی کی رمق سے دور دھکیلنے والوں میں ان قیدیوں کا بھی ہاتھ ہے۔جو مجھ جیسے سادہ لوگوں کو اس نظام کا حصہ بنا دینا چاہتے ہیں جس میں وہ خود بھی شامل ہیں۔

لیکن میں صرف ناشتے کے وقت ہی ان سے بات کرنا پسند کرتا ہوں۔یعنی کہ " آج کیا پکا ہے؟"، " آج دال تھوڑی کچی رہ گئی ہے"_" کمبخت جیل کا باورچی روز چاولوں میں کنی رکھ دیتا ہے۔_"۔۔۔

بیرک میں واپسی پر دَھکے لگنے کی وجہ سے اب پلیٹ میں چار دانے چاول رہ جاتے ہیں۔میں بظاہر پیٹ بھرنے کی اداکاری کرتا ہوا، سارا دن ہَشاش بَشاش بیرک کی اینٹوں کو محسوس کرتا رہتا ہوں سب سے بڑی اینٹ میری بیوی اور بیرک کی درمیانی دو اینٹیں مجھے میری دو بیٹیاں معلوم ہوتی ہیں۔وکیل کہتا ہے کہ مجھے چند روز بعد پھانسی دے دی جائے گی۔اسی لئے خواہشات اکھٹی کر رہا ہوں کہ موت کے فرشتے کو یہ کہوں گا وہ کہوں گا کہ میری بیٹیوں اور بیوی سے ملوا دو، یا مجھے اس قید سے رہائی دلوا دو۔اور یہ سب سوچتا ہوا ہنس پڑتا ہوں کہ ہم قیدی بھی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں جلاّد خود موت کے گھاٹ اتارتا ہے۔اور ہم موت کی سزا کا انتظار کرتے ہوئے اپنے موت کے فرشتے کو عین سامنے انسان کی صورت میں دیکھ لیتے ہیں۔قیدیوں کے لئے موت کا فرشتہ، دراصل خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ نہیں ہوتا بلکہ خدا دنیا کے گناہوں کی سزا دینے کے لئے دینا کا فرشتہ ہی مقرر کرتا ہے جسے ہم جلاّد کہتے ہیں۔انسان کی موت اُسی دن ہو جاتی ہے۔جس دن اسے یہ پتہ چل جا؟ کے میں نے اِس مخصوص دن اس دنیا سے چلے جانا ہے۔میں بھی بیرک میں بیٹھا زندگی کے احساسات سے انجان چھت سے اوورفلو ہوتے مٹکے میں گرتے پانی کی طرح اس کی نقل اتارتے ہوئے اپنے منہ سے ٹِپ ٹِپ کی آواز نکالنے لگ جاتا ہوں۔مجھے بنا کچھ کھائے پیئے، گھڑے کو دیکھتے اور ٹِپ ٹِپ کی آواز لگاتے آج تین دن ہو چکے ہیں۔میرے کچھ ہم خیال دوستوں کو گمان ہونے لگا ہے کہ شاید میں پاگل ہو چکا ہوں۔

میں چیختا ہوں چلاتا ہوں۔"مجھے انصاف دو" _ "مجھے چھوڑ دو"_"میں بے گناہ ہوں"_"میں، میں پاگل نہیں ہوں"_" تم لوگ مجھے چھوڑتے کیوں نہیں ہو؟ _"۔۔۔

ساتھی بیرکوں کے قیدی میرے بیرک کے گِرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔میں انہیں دیکھ کر پھر سے ٹِپ ٹِپ کی آواز نکالنا شروع کر دیتا ہوں۔اور بیرک کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ٹِپ ٹِپ میری موت کے آخری لمحات تک میرا ریمائنڈر بن کر زندہ رہے گی کہ اس بیرک میں فجر کے وقت ایک ریمائنڈر بجا کرتا تھا۔9 اکتوبر 1998 بروز بدھ میری پھانسی کا دن ہے۔میرے نیم مردہ جسم کو ہاتھوں میں لیے دو سپاہی کھینچتے ہوئے پھانسی گھاٹ کی جانب لے جانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بیرک میں ریمائنڈر بجنے لگتا ہے اور میں جاگ کر دفتر کی تیاری کرنے لگتا ہوں۔

عبداللہ مراثی

مصباح نوید

نگو سرگی ویلے مسجد کے کھلے صحن میں جھاڑو دیتی تھی۔نمازیوں کی آمد سے پہلے ہی سٹک جاتی۔نماز فجر کے بعد کمی کمینوں کے بچے ہی مسجد سے ملحق مدرسے کے صحن میں جمع ہوتے تھے۔ جو چنگا چوکھا کھاتے بلکہ کھاتے ہی چلے جاتے تھے، جن کی تھالیاں بھی کمی دھوتے تھے،ان نکمے گھروں میں مولوی صاحب بذات خودقران پڑھانے جاتے تھے۔رسم قل ہو، گھر میں منعقد کیا گیا میلاد ہو، یا نئی فیکٹری کی افتتاحی تقریب،مولوی صاحب رقت آمیز دعاؤں کے لیے شہرت رکھتے تھے۔معاوضے کے مطابق آنسوکم زیادہ کر لینے پر بھی قادر تھے۔وہ زمانے گئے جب مولوی تنگ دست ہوا کرتے تھے،اب تو ہٹی خوب چلتی ہے اور کچھ سرکار کی مہربانیوں سے لگے بندھے وظیفے بھی مقرر ہیں۔ حسبِ ضرورت مولویوں کولڑاکا مرغوں کی طرح میدان میں اتار دیا جاتا ہے، پھر دیکھ تماشا! قصبے کے مخیرّ الحاج میاں منظور حسین نے مسجد سے ملحق ایک مدرسہ بھی بنوادیا تھا۔جن گھروں میں روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہوتے وہ اپنے بچے مدرسے چھوڑ جاتے کہ یہاں بظاہر روٹی فری ملتی ہے۔مدرسے کے صحن میں مولوی غریب غربا کی کلاس لیتے۔ان کوڑھ مغزوں کو پڑھانے کا تو فائدہ کوئی نہیں ہے لیکن صبر شکر تو سکھایا، پڑھایا جا سکتا ہے ناں!! لفظوں سے کھلواڑ کیا جاتا تھا، بنا سمجھے لفظوں کو رٹایا جاتا۔ بچے رحل سامنے رکھے لفظوں کے جھولے پر ایسے جھولتے جیسے ہپناٹائز ہو گئے ہوں، مٹی رنگ کے زمین زادے، جنہیں جیون کے پھوگرم کھیل میں ٹھیکریوں کا کردار نبھانا ہے۔

نگو کی ماں نے جمعہ کے خطبے میں مولوی صاحب سے علم کی برکتیں سن کر سوچا کہ نگو بھی قرآن پڑھ لے تو شاید برکت کی چھتر چھاؤں ہم غریبوں کے سروں پر بھی آئے۔ جانتی نہیں تھی کہ برکتوں کی بھی بولیاں لگتی ہیں، چند لفظوں کا علم تو نگو کے گلے میں چھچھوندر کی مانند اٹک گیا،نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے۔وہ جب تک رہی ایک لمبی ہوک کے ساتھ' ہائے اوئے میریا ڈاہڈیا ربا'' کی تسبیح ہی کرتی رہی۔جب مسجد کے ملحق مدرسہ بن گیا تو بچیوں کا داخلہ مسجد اور مدرسہ میں ممنوع قرار پایا۔ٹوٹے، ادھڑے مکانوں کے بیچ ،چمکتی ٹائلوں سے مزین مسجد تمکنت اور کچھ رعونت لیے الگ سی نظر آتی۔ لشکتی مسجد میں میلے ملگجے لوگ کچھ اوپرے سے لگتے ہیں، کھلے عام آنے جانے میں کچھ جھجک سی محسوس ہوتی، اس لیے اب نگو سرگی ویلے مسجد کے کھلے دالان میں جھاڑو دیتی، بچپن میں اسی صحن میں سیپارہ پڑھنے آیا کرتی تھی۔سیپارہ پڑھنے کے بعد سیدھی میاں صاحب کے گھر چلی جاتی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام نبٹاتی، اپنی ہم عمر چھوٹی بی بی کے کمرے کی صفائی کرتی۔میاں صاحب کی بیگم ہر وقت پلنگ پر براجمان ٹی وی پر ڈرامے دیکھتی رہتی تھی۔جانے کیسے تھک جاتی کہ ذرا نگو کو فارغ دیکھتی تو آواز دے کر بلا لیتی'' چل شاواش ذرا پنڈلیوں پر پولی پولی مکیاں مار دے'' میاں صاحب کا گھر، ملک صاحب کا گھر، چودھری صاحب، راجے، ٹوانے سب گھروں میں ان کی گھر والیاں ایسے سٹور کی ہوئی تھیں جیسے اناج بھری بوریاں ذخیروں میں محفوظ ہوتی ہیں۔روپہلی سنہری تاروں سے کشیدہ، ریشم میں لپٹی ہوئیں۔کبھی گھر سے باہر نکلیں بھی تو تو چادروں، عباؤں میں پیک گٹھڑیاں سی دکھتیں جنھیں احتیاط سے سامان مانند ادھر ادھر لے جایا جاتا تھا۔

نگو کی ماں تو لٹکے پستانوں کے ساتھ دوپٹے کا ایک پلو سر پر دوسرا کندھے کے پیچھے لٹکائے، گوبر کا ٹوکرا اٹھائے کیٹ واک کرتی، پائنچے پنڈلیوں سے اوپر اٹھائے پانی میں چاولوں کی پنیری لگاتی، کھیت کے کنارے بیٹھی دامن اٹھائے بچے کو دودھ پلاتی بھی نظر آتی تھی۔اور پھر کانٹوں سے بے پرواہ ننگے پیری چلتی ہوئی ماں نے نگو کو سکول بھی بھیجنا شروع کر دیا۔نگو سکول سے چھٹی کے بعد میاں صاحب کے گھر اپنی ڈیوٹی پر پہنچ جاتی تھی۔چھوٹی بی بی کے کمرے میں رنگین کتابیں ریک میں سجی تھی۔چھوٹی بی بی تو کورس کی کتابوں کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتی۔لیپ ٹاپ، سیل فون اور جانے کیا کچھ، انہی کے ساتھ مصروف رہتی تھی۔نگو ریک سے ایک ایک کتاب احتیاط سے اٹھاتی، رنگین تصویریں آنکھوں میں خواب بھر دیتی تھیں۔لفظوں کو چھوتی، لفظ انگلیوں کے پوروں کے ساتھ چمٹ کر رہ جاتے، شریر لڑکوں کے سے چلبلے لفظ، چیونگم چباتی، آنکھیں مٹکاتی، پڑ پڑ بولتیں، کھلکھلاتی ہوئیں شوخ لڑکیوں جیسے لفظ، آکاش میں تیز ہواؤں میں ڈولتی پتنگوں جیسے، چھلکنے کو بیتاب پانی سے بھرے بادلوں جیسے لفظ!!

پھر رنگوں میں ہولی کھیلتی نگو کو بھی ایک ٹین کے بکسے، دو چارپائیوں، دو کرسیوں، چار کھیسوں سمیت دوسرے گھر پہنچا دیا گیا۔جولاہا کھٹا کھٹ کھڈی چلاتا رہا۔مکڑی جالا بنتی رہی۔خاوند ملکوں کے پاس راہک تھا۔ان سے ڈنڈا ڈولی کرواکر آتا تو گھر آکر نگو کی ڈنڈا ڈولی کر دیتا۔ نگو اس ڈنڈا ڈولی کو معمول کی بات سمجھتی تھی۔اور اس میں غیر معمولی ہے بھی کیا!!۔ہوش سنبھالتے ہی تشدد کو مہمیز کرتی گالیاں اور الٹی پرات پر ہاتھوں کی تھاپ کے ساتھ ایسے گنگناتے بول سنتی آئی تھی جو پیار اور مار کے ایک ہی معنی رکھتے تھے۔

اڈی ٹپا کھیلتے سال گزرتے گئے۔ ہاتھ میں لا حاصلی رہی تو بچے کے لیے مسجد میں جھاڑو پھیرنے کی منت مانگ لی۔ بچہ پیدا کرنا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوتا۔ کمی عورتیں تین چار لمبی سانسوں میں کھٹاک سے بچہ نکال باہر کرتی ہیں یا کبھی کوئی رکاوٹ پڑ جائے تو تین چار ایڑیاں رگڑ کر جان دے دیتی ہیں، مر جانا بھی کوئی خاص واقعہ شمار نہیں ہوتا۔ ہاں! برادری کو فوتیدگی ہی پر ذرا بےفکری کا کھانا میسر آتا ہے۔ ہر دوسرے گھر میں ماں، بیٹی، بہو پیٹ سے ہیں، گھر کے صحن میں بندھی بھوری گائے یا پھر ٹوٹے، جھولتے دروازے کے پٹ سے جھانکتی بکری سب گابھن ہیں_ ایسے میں اگر نگو کا پاؤں بھاری نہیں ہوتا، تو کون سا زمین نے گول گھومنا چھوڑ دینا تھا!! لیکن جھاڑو کمال کر گیا۔ نگو ماں بن گئی۔ بیٹے کو کپڑے میں لپیٹ کر فوری طور پر مسجد لے جایا گیا۔ مولوی صاحب عام طور پر نومولود کے گھر میں یا ہسپتال جا کر کان میں اذان دینے کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ جو ہوم سروس افورڈ نہیں کر سکتے، انھیں مسجد آنا پڑتا۔ سبز گنبد کے سائے کو ناکافی جانتے ہوئے مولوی صاحب اے سی لگے ٹھنڈے ٹھار کمرے میں براجمان تھے، بیدلی سے کان میں اذان کو پھونکا گیا اور بیٹے کا عربی نام عبداللہ تجویز کیا، ساتھ ہی انگلی اٹھا کر تاکید بھی کی: اوئے کم ذاتو! نام بگاڑنا نہیں، اسلامی نام ہے، توہین ہوتی ہے"_ نگو کے شوہر پر تو لفظ: توھین " سے کپکپی طاری ہو گئی اس ملوکڑے نے اس لفظ کے ہاتھوں کئیوں کا حشر نشر جو دیکھ رکھا تھا۔ جب تک زندہ رہا صرف عبداللہ نہیں بلکہ عبداللہ صاحب کہہ کر پکارتا رہا۔

نگو کا چھوٹی بی بی کے گھر جانے کا معمول جاری رہا۔ اب چھوٹی بی بی چھوٹی نہ رہی تھی پر کہلاتی چھوٹی بی بی ہی تھی۔ میاں صاحب نے نیک شریف داماد لے پالک رکھ لیا تھا، ناخلف نکلا، بلے کی طرح گھر گھر دودھ سڑکنے کی عادت تھی۔ لوگ چوہدری بلے کو دیکھ کر ہی راہ بدل لیتے، دروازہ بھیڑ دیتے تھے_ لعن طعن کرتے، پچھتاتے، میاں صاحب اور بڑی بی بی بھی اگلی دنیا کو سدھارے۔ چوہدری بلے کو دیسی کپی لڑ گئی، ہارٹ اٹیک کا پردہ ڈال کر دفنایا گیا تو چھوٹی بی بی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ اب تو نگو سارا دن چھوٹی بی بی کے پاس ہی رہتی۔ رات ہی کو گھر جاتی۔ چھوٹی بی بی نیند اور ڈیپریشن کی گولیاں پھانک کر دن رات منہ سر لپیٹے پڑی رہتی تھی۔ پشتی نوکر گھر میں تھے نہ فکر نہ فاقہ۔ نگو سہیلی بھی تھی اور خدمتگار بھی۔ سکول کالج کی دوستوں کے ساتھ چھوٹی بی بی کی نبھتی نہیں تھی، کون نگو کی طرح انگلیوں کے اشارے پر چلتا ہے!۔ عبداللہ تو دو ماؤں کا سانجھا تھا۔ چھوٹے پلے کی طرح کوں کوں کرتا دونوں ماؤں کے گھروں میں دوڑ لگاتا رہتا۔ نگو اب محض نگو نہیں رہی نگو جھلی ہو گئی تھی۔ ہاتھ کام کاج میں لگے رہتے اور زبان پر: ہائے اوہ میریا ڈاہڈیا ربا! " کے ساتھ ایک اور ورد بھی جاری ہو گیا ''میں اپنے پت کو پڑھا لکھا وڈا افسر بناؤں گی''۔ نگو کے چاؤ کو ہوا دینے کے لیے گاؤں میں لڑکوں کا ہائی سکول بھی موجود تھا_ ساری برادری میں جب بچہ روٹی کھانے جوگا ہو جاتا اسے روٹی کمانے پر لگا دیا جاتا تھا۔ گھروں میں، کارخانوں میں، کاریگروں کے پاس، چائے کے ڈھابوں میں، ٹرک ہوٹلوں میں یہ بچے بھاگتے دوڑتے، ہر طرح کی مار کھاتے نظر آتے۔ ایک نگو جھلی کا بیٹا بیگ اٹھائے سکول جاتا دکھائی دیتا_ لیکن وڈی افسری اور صاحبی تو ایک طرف رہی سکول جاتے ہی وہ عمر بھر کے لیے عبداللہ مراثی ہو کر رہ گیا۔ عبداللاؤں کے تو ہر جماعت میں ڈھیر لگے تھے، ماسٹروں نے شناخت اور اوقات نمایاں کرنے کے لیے عبداللہ نام کے ساتھ مراثی بھی چپکا دیا۔ نگو جھلی نے تو ہاتھ سے جھاڑو لے کر قلم تھمایا تھا کہ: ''پتر! اپنے نصیب آپ لکھ!'' اور ماسٹروں کو بونس میں ہنسنے واسطے ایک لطیفہ میسر آ گیا۔

عبداللہ مراثی لکھنے پڑھنے میں طرار تھا۔ حرفوں کے جوڑ توڑ میں بھی ماہر ہو گیا۔ کمی ماں پیو کی اولاد تھا_ اس لیے ماسٹروں کی خدمت میں بھی پیش پیش رہتا۔ سکول ماسٹر جب بور ہوتے تو آواز دے کر عبداللہ کو بلا لیتے۔'' اوووو مراثیی اوئے!۔۔ عبداللہ ہاتھ باندھ سر جھکا کر ماسٹر کی کرسی کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ ماسٹر بولتا: تیں کا ہے کو جمارے؟'' (بیک گراونڈ میں دبی دبی ہنسی کی کھی کھی)، عبداللہ ابھی'' کیوں'' کے روبرو سٹپٹا رہا ہوتا کہ ماسٹر اگر مگر کے ساتھ امکانات پر روشنی ڈالنے لگتا: ''اوئے! تیں ماں اٹ (اینٹ) جم لیتی، تیں پیو دیوار میں لگا لیتا "- ہاہاہاہا۔۔ کی بے ہنگم آواز کے ساتھ ماسٹر کی توند اچھلتی نظر آتی۔ لطیفے بھی تو ستم گر ہیں جن باتوں پر رونا بنتا ہے، انہی باتوں پر ہنساتے ہیں۔ پھر عبداللہ کو صاحب کہہ کر پکارنے والا باپ بھی نہیں رہا، سانپ کاٹے پر پرلوک سدھارا۔ سال رسی ٹاپتے گزرتے گئے_ اب عبداللہ مراثی چھریرا پھرتیلا کالا ہرن لگتا تھا، دسویں کے امتحان کی تیاری بھی کرتا، موقعہ ملنے پر چھوٹا موٹا کام بھی پکڑ لیتا۔ دیواروں پر ڈسٹمپر کرنے کا ماہر تھا، شادی بیاہوں میں ویٹر بھی بن جاتا۔ چھوٹی بی بی کے گھر کا تو ہر کام جو چار دیواری سے باہر تھا، اسی کے ذمہ تھا۔ چوکڑیاں بھرتا، گھنٹوں کا کام منٹوں میں نبٹاتا۔ دسویں پاس کرنے سے ہی پہلے ماں نے عبداللہ مراثی کا بیاہ رچا دیا۔ مورنی سی لڑکی بیاہ لائی، عبداللہ مور کی طرح پنکھ پھیلائے اس کے اردگرد پائل ڈالتا رہتا کہ مورنی کو بھی چار دن ہی عطا ہوئے تھے۔ وہ چھٹی پرانی اترنیں پہننے والے جن کو زندگی سیلیبریٹ کرنے کے لیے نئے لباس کے اذن کے ساتھ، مرنا اور پرنا دو ہی ایونٹ عطا کرتی ہے، مورنی نے دونوں جلد بھگتا کر زندگی سپھل کر دی۔ بچی کی پیدائش پر دائی نے کوشش تو بہت کی لیکن خون نہیں رکا۔ نچڑ گئی، شوہدی میں خون تھا ہی کتنا! پائلیں بھول کر مورا اپنے پاؤں ہی دیکھتا رہ گیا۔ ابھی بےبسی مورنی کی قبر ہی پر ششدر کھڑی تھی کہ الھڑ، بےنیاز قدرت نے پھر سٹیرنگ گھما دیا۔ بدحواس ہوئی نگو جھلی

سڑک پار کرتے ہوئے ٹریکٹر سے ٹکرا گئی، جان سے گئی، شکر ہے کہ ٹریکٹر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ورنہ تنخواہ دار ڈرائیور کی بھی جان نکال دی جاتی۔

کھلنڈرا عبداللہ بیوی اور ماں کے جانے سے تنہا ہی نہیں بڈھا بھی ہوگیا تھا۔ جھکے کندھوں کے ساتھ اپنے آپ کے ساتھ باتیں کرتا رہتا۔ جب رونے کو جی چاہتا تو آتے جاتوں کو روک کر لطیفے سنانے لگتا_ اپنے لطیفوں پر آپ ہی ہنستے ہوئے آنکھوں میں آنسو آجاتے، ہنسی رک جاتی پر آنسو نہ تھمتے۔

عبداللہ مراثی کے سر پر لفظ مچھروں کی طرح گھوں گھوں کرتے رہتے، پکڑائی نہیں دیتے تھے۔ اب وہ امتحان شمتحان بھول کر ایک نئی کٹھالی میں پڑ گیا۔ کاکی سنبھالتا، رنگ روغن کرتا، کئی بار امتحان دیا لیکن کامیاب نہ ہوا۔ چھوٹی بی بی کے پاس بیٹھا عبداللہ مراثی اپنے دکھڑے قہقہوں میں پرو رہا تھا: ''ماسٹر صاحب راستے میں مل گئے تو میں نے انھیں کہا کہ ماسٹر جی! میں تو نہ پڑھ سکا لیکن اپنی کاکی کو یونی ورسٹی میں پڑھاؤں گا'' _بی بی!'' ماسٹر جی کا تو ہاسا ہی نکل گیا'' کہنے لگے:

''اوئے تو واقعی نگو جھلی دا پتر ہے، وہ بھی کہتی تھی میرا پت وڈا افسر بنے گا، ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نوں جپھے'' _ اور پھر میرے کندھے تھپکا کر یہ کہتے ہوئے ایک طرف کر دیا ''پچھے ہٹ اوئے نماز سے دیر کروادی'' اور مسجد کی طرف لپک گئے۔

کوڑھ کرلی سہی پر کاکی کو سکول ضرور بھیجوں گا۔ کاکی جس کے نصیب میں نام بھی نہیں تھا ہر کوئی کاکی کاکی ہی کی صدا لگاتا تھا، اپنے ننھے منے ہاتھوں سے فرش پر پوچا لگا رہی تھی۔ حیران، پریشان، سوال اٹھاتی، کاکی کی آنکھیں ہو بہو اپنی دادی جیسی تھیں۔ وہ چھوٹی بچی سے زیادہ ایک ادھیڑ عمر عورت دکھائی دیتی تھی۔ عبداللہ مصلی جب اسے ہر وقت جھاڑو پوچا کرتے دیکھتا تو اس کا دل کسی بے مہر مٹھی میں بھنچتا تھا۔ چھوٹی بی بی تو مہارانی تھی۔ دوسروں کو استعمال کرنے کا ہنر خوب جانتی تھی۔ کاکی جب تک اس کے پیروں کی تیل سے مالش نہ کرتی اسے نیند نہ آتی۔ جب بھی عبداللہ مراثی کاکی کو سکول بھیجنے کی بات کرتا تو وہ گھما پھرا کر بات نگو جھلی تک لے آتی۔'' نگو جھلی جب تک رہی آس نراش کے ہیر پھیر میں رہی، نہ قدموں نے زمین کو چھوا، نہ آسمان نے دادرسی کی۔ لفظ انگارے ہی رہے، پھول نہ بنے۔ اوروں کو بھی دیکھ !! جیسے ڈھور ڈنگر ہوں، کیسے امن سکون سے رہتے ہیں، جو مل گیا کھا لیا، نہ ملا تو نہ سہی، گلے میں سنگل ڈالے، اپنے مالکوں کے در پر پڑے، خصم اپنڑے دا در نہ چھڈ دے، بھاویں وجنڑ جتے۔'' ۔۔۔۔۔ دکھ بھری لمبی سانس ادھوری چھوڑ کر چھوٹی بی بی بولی: ''اللہ بخشے کاکی کی ماں نہیں رہی، تو کیا! میں ہوں نا۔۔۔۔، تو چنتا نہ کر!'' کاکی کو کام کاج میں ماہر کر دوں گی۔ جہیز بھی اچھا دوں گی، تو پرائے دھن کو پڑھا لکھا کر کیا کرے گا!!! بیٹوں جیسا ہے تبھی سمجھاتی ہوں ورنہ مجھے کیا پڑی! رب سوھنڑے نے مجھے کسی آزمائش میں ڈالا ہی نہیں۔ گھر میں ہر طرح کا فضل ہے لیکن دیکھ پتر! اس نکی جہی کو لفظوں کے گورکھ دھندے میں نہ الجھا، اس نے تو گھاس کی طرح زمین پر ہی بچھنا ہے لفظ لگ گئے نا، تو سر اٹھالے گی بن موت ماری جائے گی.....'' عبداللہ مراثی چھوٹی بی بی کے پاس اکڑوں بیٹھا سر ہلاتا رہتا لیکن آنکھوں آنکھوں میں کاکی سے سکول بھیجنے کا وعدے بھی کرتا رہتا تھا۔ مراثی باپ کے وعدوں پر بیٹی وشواس کیا کرتی! وہ جانتی تھی کہ چاہے من میں اسمان چھونے کی آشا ہو پر ایسے باپوں کے پیر دلدلی زمین میں دھنسے ہوتے ہیں۔ کاکی کو کشف مل گیا تھا کہ کتابوں کی جھاڑ پونچھ سے محض گرد ہی حاصل ہوتی ہے علم ہو یا خواب خریدنے ہی پڑتے ہیں۔ برسات ہوتے ہی کاکی خود رو جھاڑی مانند ہری بھری ہوگئی تھی۔ اس سبزے سے جانتے بوجھتے انجان بنی چھوٹی بی بی سجری سویر کاکی کو کھیتوں سے تازہ سبزی توڑ کے لانے کے لیے بھیج دیتی تھی۔ عبداللہ پیڑھی پر چھوٹی بی بی کو حال احوال سناتا رہتا، وعدے کرتی ہوئی عبداللہ کی آنکھوں کو وہیں صحن میں منتظر چھوڑ کر کاکی دوڑ کر بھیتر پار کر جاتی۔ جانے سبزیوں کے ٹوکرے بھرتی رہتی تھی کہ گھنٹہ گھنٹہ پلٹ کر نہ آتی۔ ایک دن گھنٹے بھی گزرتے گئے اور کاکی نہ پلٹی۔ رات گئے تک چھوٹی بی بی کاکی کی تلاش میں ادھر ادھر ہرکارے دوڑاتی رہی۔ کہیں سے کچھ خبر نہ ملی۔ جیسے کاکی کسی حرف پر لگا سہو کا نقطہ ہو جو ایسا مٹا دیا گیا کہ نشان بھی باقی نہ رہا۔

عبداللہ مصلی نے ہر گھر میں جھانکا، آتے جاتے راستوں سے، کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے پوچھا، لوگوں کے ہاسے مذاق سہنے کا تو جماندرو عادی تھا لیکن اب یہ کیسی برچھیاں ہیں جو سینے میں ترازو ہو رہی ہیں!! "مانتا ہوں" توبہ استغفار!" وہ کانوں کی لووں کو انگلیوں سے چھوتا، "خدا بے نیاز ہے لیکن اتنی بے نیازی؟؟ خدا تو ملک ساب سے بھی بڑھ کر سخت دل کا نکلا۔۔۔، ہائیسے اوہ میریا ڈاہڈیا ربا!" ایک ہوک عبداللہ کے سینے سے نکلتی تو آوازیں پتھریلی دیواروں سے نکل کر تعاقب کرتیں: "بیٹی گھر سے بھاگ گئی اور یہ ٹپے ماہیے گاتا پھر رہا ہے، کھی کھی۔۔ ہاہاہاہا۔۔ مراثی جو ہوا"۔

جیسے کئی پیالے بھنگ کے پی لیے ہوں وہ خوشی غمی سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ لیکن ایمان قائم تھا کہ کاکی واپس آجائے گی اور کاکی سکول بھی جائے گی۔

کئی دن کی بیکاری اور خواری کے بعد چھوٹی بی بی سے اس نے کچھ پیسے ادھار مانگے، کچھ دیر کاکی کے پلٹنے کا انتظار کیا پھر پلو میں کاکی سے کیا گیا سکول بھیجنے کا وعدہ باندھ کر گھر سے نکل آیا۔

نزدیک قصبے کی پرچون مارکیٹ سے ایک بڑا تھیلا پاپڑوں کا خریدا، سائیکل پر رکھ کر بازار کا ایک چکر لگایا۔ ایک دو بچوں نے پاپڑ خریدے، اکثر نے ماؤں سے ڈانٹ ہی کھائی۔ لڑکیوں کے کالج کے سامنے کافی

دیر کھڑا رہا،لڑکیوں کو باتوں اور ذائقوں کے چٹخارے پسند ہوتے ہیں۔اس لیے وہاں کافی بکری ہوگئی۔شام ڈھلے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے نظر شادی ہال کے باہر گراونڈ میں لگے قناتوں پر پڑی۔کیا شاندار قناتیں تھیں جیسے کسی بادشاہ نے پڑاؤ کیا ہو۔ادھ بھرے پولی تھین بیگ کی طرف نگاہ کی،نیم دلی کے ساتھ ذیلی سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا۔رانا صاحب کے بیٹے کا ولیمہ تھا۔شادی تو لاہور میں ہوئی تھی۔ ووٹرز اور دوڑ میں ذرا پیچھے رہ جانے والے شریکوں کے لیے ولیمہ قصبے ہی میں ارینج کیا گیا تھا کہ اپنا ساڑ یہیں پھونک لیں،نئی رشتے داری تک دھواں نہ پہنچے۔چونچیں طوطوں کی طرح لال کیے،کتر کتر بولتیں،شراروں غراروں میں الجھتیں عورتوں کا ریوڑ ،دلہن کے لاکھوں کروڑوں کی مالیت کے لہنگے کا ذکر اس شد مد سے کر رہا تھا جیسے ساری دنیا اسی لہنگے کے حدود اربعہ میں سمائی ہوئی ہے۔میمنوں کی طرح نٹ کھٹ اچھلتے کودتے بچے اس کے گرد جمع ہوگئے۔بھیڑ کے ریلے میں بہتا ہوا عبداللہ مراثی قنات کے اندر کیسے پہنچا اسے خبر ہی نہ ہوئی،خبر تب ہوئی، جب ایک زور دار تھپڑ اس کے منہ پر آ کر لگا:اوئے! تجھے ہمت کیسے ہوئی اندر گھسنے کی!ایک گھونسا اڑتا ہوا آیا دوسرا بھی،کچھ ٹھڈے زیر ناف اور مضبوطی سے تھاما ہوا پاپڑوں کا تھیلا ہاتھ سے چھوٹ گیا۔۔تڑاق تڑاق دھن دھنن دھن۔۔۔،اتنے میں آواز آئی:''کھانا لگ گیا ہے_''

ہجوم عبداللہ مراثی کو وہیں چھوڑ کر کھانے کے میزوں کی طرف دوڑ پڑا۔ اوجھڑیوں کے تودے سنہری پنی لگی کرسیوں پر بکھرے تھے۔ان اوجھڑیوں میں خوراک کے ڈھیر ایسے گرتے جیسے فلیش کے بعد کموڈ کے پائپ لائن سے گزر کر فضلہ گٹروں میں گرتا ہے_

چہرے غائب ہوگئے تھے بس فربہ گردنوں پر سور کی تھوتھنیاں فکس تھیں۔ پیلے پاپڑ سبز گھاس پر، بکھرے ہوئے تھے۔زمین پر سفر تمام ہوا، کھلے منہ، کھلی ہتھیلوں اور چاروں شانے چت پڑا عبداللہ مراثی اس جہاں پہنچ گیا جو شاید ستاروں سے آگے ہے

جاوید صبا

یہ کہہ کے شہر بھر سے کہا اس نے دل کا حال
اس کو پتا نہیں چلے اس کو خبر نہ ہو

قلعہ نما مکاں کے میکینوں کو کیا خبر
بے گھر ہے وہ کہ جس کا کسی دل میں گھر نہ ہو

اشک غم حسین سے جھولی بھری رہے
دامن کبھی کسی کا تہی عمر بھر نہ ہو

دوبارہ بھی ملی تو کریں گے اسے بسر
یہ زندگی جو ہم سے بسر ہو مگر نہ ہو

بازار سے گزرتے ہوئے سوچتا ہوں میں
جو راہ گھر کو جاتی ہے وہ مختصر نہ ہو

کیا دکھ ہے بے گھری کا کبھی ان سے پوچھیے
جن کی زمین اپنی ہو اور اپنا گھر نہ ہو

چل پڑیے راہ شوق پہ بے سمت و بے لگام
زاد سفر کا کیا ہے اگر ہو اگر نہ ہو

اس پر جمی ہوئی ہیں نگاہیں کہ اس کا حسن
جتنا بھی اشکار ہے صرف نظر نہ ہو

☆

صادق مری

مت پوچھ یہ کس زعم کا مارا ہوا مَیں ہوں
انجام یہ ہونا تھا کہ ہارا ہوا مَیں ہوں

یہ زخم بھی تو رنگِ گلِ لالہِ خوش رُو
اے موسمِ گل تیرا سنوارا ہوا مَیں ہوں

اب اُس کی کشش باندھ کے رکھتی ہے مجھے بھی
وہ کوہِ ندا جس کا پکارا ہوا مَیں ہوں

اس عشق میں دامن یہ بچاتا بھی تو کیسے
اک آگ کے دریا سے گزارا ہوا مَیں ہوں

تجھ میں بھی مرا عکس تھا اے آئینہ تمثال
خود اپنی تمناؤں پہ وارا ہوا مَیں ہوں

جیسی یہ زمیں ہے وہ مرا گھر بھی نہ ہوگا
سنتے ہیں کہ جنت سے اتارا ہوا میں ہوں

حَمل ہوں کسی ساحلِ تند آب پہ سرگرم
گردابِ سرِ موج ابھارا ہوا میں ہوں

خرید و فروخت

احمد ندیم قاسمی

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے
مگر کون خریدے گا مجھے!
وہ میری غیرت و معیار حمیت کو کہاں بیچے گا!
یہ وہ اجناس ہیں جن کی کوئی قیمت ہی نہیں
اور قیمت کوئی دینے کو جو تیار ہو
وہ پوری زمیں
اور ستارے جو زمیں سے نظر آتے ہیں
کہاں سے دے گا؟

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے
مگر میرا ضمیر اتنا گراں ہے
کہ مجھے کوئی خریدے گا تو پک جائے گا
اور بک کر بھی مرے دام نہ دے پائے گا

وہ مجھے بیچنے نکلا ہے، مگر
میرے آقا کو اگر
فرش سے تا عرش کی ہر چیز تھما دو مرا گاہک
تو تھما دے۔۔۔۔لیکن
مجھ میں وہ آگ ہے
جو بڑھتا ہوا ہاتھ بھسم کر دے گی
صرف اک چیز ہی قیمت مری کم کر دے گی
بے ضمیری۔۔۔۔کہ جو ہستی کو عدم کر دے گی!